پاؤں میں پھول

خواجہ احمد عباس

مکتبۂ سلطانی بمبئی

پہلا ایڈیشن ..... ایک ہزار ...

قیمت: دو روپیہ اٹھ آنہ
عـ۲/۸

ناشر
مکتبۂ سُلطانی
۱۰۰ ابراہیم رحمت اللہ روڈ۔ بمبئی ۳

پرنٹر و پبلشر
سُلطان حسین تاجر کتب نے اپنے سلطانی فائن آرٹ لیتھو اینڈ پرنٹنگ پریس
بھنڈی بازار بمبئی ۳ سے شائع کیا

کرشن چندر

تعارف

خواجہ احمد عباس کے افسانے جنس کے محور پر نہیں گھومتے۔ جنس کا ذکر اُن کے ہاں ضمناً ہے۔ کسی سماجی مسئلے یا معاشی اُلجھن یا سیاسی امور کے بیان میں جنس کا ذکر آ جائے تو آ جائے، وہ بھی اگر اس کی ضرورت پڑے تو، ورنہ نہیں۔ اُن کے افسانوں میں جنسی حدت بہت کم ہے۔ معشوق کا سراپا مشکل ہی سے ملے گا۔ ایسی تشبیہیں اور استعارے بھی نظر نہیں آتے جن کا اطلاق کم از کم اس دُنیا کی عورتوں پر نہیں ہوتا۔ جنس کے معاملے میں عباس ارضی قدروں کی طرف جھکتے نظر آتے ہیں (بارہ گھنٹے)۔ آسمانوں کی طرف نہیں اُڑتے۔ مبالغے پر حقیقت کو ترجیح دیتے ہیں، جذباتیت پر عقلیت کو، خوبصورتی پر انسانیت کو۔ انہیں معلوم ہے کہ انسان محض جنس نہیں ہے، وہ مرکب ہے مختلف جذبات و احساسات کا، مجموعہ ہے متضاد

جبلّات کا، اُس کے خمیر میں مختلف قوتیں کام کرتی ہیں اور اُس کے مزاج کی ترکیب میں سماجی و معاشی ماحول، وراثت، تربیت اور اقتصادیات کے پس منظر کو بڑا دخل ہے۔ انسان اور اُس کے سماج کے متعلق عباس کا نظریہ سائنسی ہے، رومانی نہیں۔ مشینی ہے، ماضی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ایک ایسے سماج میں جو ابھی ماضی ہے صنعتی نہیں، جو عقل کی بجائے توہمات پر زیادہ یقین رکھتا ہے اور جو جنسی محبت کو رومانی عینک سے دیکھنے کا عادی ہے، عباس کے افسانے ابھی تک شک و شبہ کی نظروں سے دیکھے جاتے ہیں۔ عباس جاہلوں، جذباتیوں اور اعتقاد پرستوں کے افسانہ نگار نہیں ہیں۔ وہ پڑھے لکھے باشعور بالغ اذہان کے افسانہ نگار ہیں۔ وہ افسانہ نگاروں کے افسانہ نگار ہیں۔ وہ اپنی تحریروں میں ماضی اور حال سے آگے جا کر مستقبل کی تعمیر کے متعلق زیادہ سوچتے ہیں۔ اُن کا ادب صنعتی انقلاب کے فروغ کا ادب ہے۔ اور جوں جوں ہندوستان میں اس انقلاب کو تقویت حاصل ہوگی۔ عباس کی تحریروں کی مانگ بڑھتی جائے گی۔ اور اگر کبھی مخالف انقلاب آیا اور فسطائیت کے اندھیرے نے ہمیں گھیر لیا تو عباس کی تحریریں سب سے پہلے جلائی جائیں گی۔

عباس مستقبل کے متعلق زیادہ سوچتے ہیں۔ کہیں اس سے آپ یہ اندازہ نہ لگائیں کہ وہ حال سے بے بہرہ ہیں۔ حال کے دقیق مطالعے کے بغیر مستقبل کے متعلق اشارے نہیں کیے جا سکتے۔ جہاں تک حال کے مشاہدات اور تجربات کا ذکر ہے عباس بے حد ذکی الحس واقع ہوئے ہیں۔ اس معاملے میں اُن کی صحافی زندگی نے بھی اُنھیں بڑی مدد پہنچائی ہے۔ اس ملک میں جہاں

اخبار بینی تضیعِ اوقات میں داخل ہے۔ جہاں عشقیہ مضامین کے علاوہ اور کسی تحریر کا شمار ادب میں نہیں ہو سکتا، وہاں عباس کی جرأت یقیناً قابلِ احترام ہے کہ وہ ہر نئے موضوع پر کچھ نہ کچھ ضرور لکھ لیتے ہیں جس کا شمار اپنے حسنِ بیان اور قوتِ تخلیق کے اعتبار سے سچے ادب میں ہو سکتا ہے جنگ ہو یا فتح ہو۔ آزادی کا دن ہو یا کشمیر کی لڑائی ہو۔ یا بمبئی کا فرقہ وارانہ فساد ہو یا راشننگ کا جھگڑا ہو، ان کے افسانے ہر موضوع کو سمو کر ایک ایسی دلکش کیفیت پیدا کر دیتے ہیں جو انادی بھی ہے اور ابدی بھی۔ ایسی وقتی موضوعات پر قلم اٹھانے کے بعد وہ اپنی تحریروں میں اُن پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہیں کہ افسانہ آج بھی دلچسپ معلوم ہوتا ہے اور آج سے بیس سال بعد بھی دلچسپ معلوم ہوگا۔ اخبار کی رپورٹ میں اور ادب میں یہی فرق ہے۔ عباس کی تحریروں میں فوری تاثر اور مستقل تاثر دونوں ملتے ہیں (ایک پائل پیا دل)

مجھے عباس کے افسانوں میں جو بات سب سے زیادہ پسند ہے وہ دوسروں کو سب سے زیادہ ناپسند ہے۔ یعنی اُن کا اندازِ نگارش، اس کی بے مثال سادگی اور سلاست۔ منٹو کے ہاں مرعوب کن شوخی کی نمود ہے، عصمت کے جملے اپنے موضوع سے قطع نظر بڑے شستہ، بڑے منجھے ہوئے جاگیردارانہ رکھ رکھاؤ کے حامل ہوتے ہیں۔ بیدی کے ہاں متین رنگ غالب ہے۔ اور اپنے ہاں بھی اسی اندازِ نگارش کے نمونے ملتے ہیں جو جاگیردارانہ ماحول میں نہایت مناسب اور بھلے معلوم ہوتے ہیں لیکن جو صنعتی دور کی ترجمانی کے لئے

زیادہ موزوں نہیں۔ اس انداز نگارش اور عباس کے مسائل میں وہی فرق ہے جو ہارڈی اور ہیمنگ وے میں ہے۔ جو TESS اور FOR WHOM THE BELL TOLLS. میں ہے۔ میں جب اپنے افسانے پڑھتا ہوں اور عصمت، بیدی اور منٹو کے، تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم لوگ اک نہایت خوب صورت رتھ پر بیٹھے چلے جا رہے ہیں اور عباس ہوائی جہاز میں سفر کر رہا ہے۔ اپنے ہاں شعریت ہے خوب صورتی ہے، بیتے منقش ہیں، جوہ مطلا ہے، گھوڑوں کے گلے میں نقرئی گھنٹیاں ہیں، لیکن چال میں قیامت کی سست رفتاری ہے، اور سڑک کچی ہے، جگہ جگہ ہچکولے لگتے ہیں۔ لیکن عباس کی تحریروں میں کہیں ہچکولے نہیں ہیں، سڑک صاف سیدھی اور پختہ ہے اور قلم میں ربڑ کے ٹائر لگے ہوئے ہیں۔ ہوا کی روانی اور پرواز کی تیز رفتاری دونوں اس میں موجود ہیں۔ ظاہر ہے کہ موجودہ دور اور آنے والے زمانے کے مسائل ہم رتھ میں بیٹھ کر نہیں طے کر سکیں گے۔ اس کے لئے ہمیں فضائی پرواز ہی سے کام لینا پڑیگا شعریت کو کم کرنا ہوگا اور جاگیردارانہ تکلفات کو خیرباد کہنا ہوگا کہ جمہوریت کا تقاضہ بھی ہے کہ ادیب زیادہ سے زیادہ صاف، آسان اور سلیس زبان استعمال کریں جو جمہور کی سمجھ میں آسکے۔ اسے بھاری بھرکم الفاظ سے مرعوب کرنے کی کوشش نہ کریں۔ مغرب میں تو ادب کے ڈانڈے بلند صحافت سے ملتے جا رہے ہیں اور رپورتاژ کو فروغ حاصل ہو رہا ہے۔ جملے چھوٹے چھوٹے اور سلیس تر ہوتے جا رہے ہیں لیکن ان کی فکری رفتار تیز تر ہوتی جا رہی ہے، جیسے انھیں پر میسر آ گئے ہوں۔ اپنے ہاں آپ کو

یہ رنگ صرف عباس کے ہاں ملے گا، دوسروں کے ہاں اس سے بہت کم۔ یہ نفقدان تو مغرب میں بھی ہے۔ اس وقت برطانیہ سے زیادہ امریکہ میں اور فرانس سے زیادہ روس میں آپ کو یہ اندازِ نگارش ملے گا، کیونکہ جہاں مشینی دور کی دھڑکن تیز ہے وہاں کے ادیبوں کی زبان بھی زیادہ نئی، مختصر اور تیز رفتار ہے۔ وہاں زندگی کی لے تیز ہو چکی ہے، زیادہ باتیں بنانے کا وقت نہیں۔ لوگ مبہم انجھاوے پسند نہیں کرتے۔ وہ سیدھا، صاف، براہِ راست اندازِ نگارش زیادہ پسند کرتے ہیں۔

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ عباس سادگی اور سلاست پر حسن اور شعریت کو قربان کر دیتے ہیں۔ حسن اور شعریت کے وہ بھی قائل ہیں اور اُسے سچے ادب کے اوصاف میں شمار کرتے ہیں، لیکن وہ ظاہری حسن اور ظاہری شعریت کے پرستار نہیں۔ اُن کے خیال میں محض خوبصورت جملوں سے خوبصورت ادب کی تخلیق نہیں ہوتی۔ وہ حسن اور شعریت کی تخلیق ایسے ادب میں دیکھتے ہیں جو موضوع اور اندازِ نگارش کے باطنی امتزاج سے پیدا ہوتا ہے۔ وہ فقروں کے رنگ و روغن کے قائل نہیں۔ وہ موضوع کی لے کو دیکھتے ہیں جو موجودہ دور میں اکثر و بیشتر تلخ ہے اور تیز رفتار ہے، اور پھر وہ اپنی زبان سے فونی الھڑک لباس اتار دیتے ہیں، اور پھر اُن کی زبان اور اُن کے جملے موضوع سے اس طرح ہم آہنگ ہو جاتے ہیں کہ موضوع کی رفتار جملوں کی رفتار بن جاتی ہے اور موضوع کا رنگ جملوں کا رنگ بن جاتا ہے۔ اور اس طرح جو نئے حسن اور نئی شعریت کی تخلیق ہوتی ہے وہ جملوں کے اوپر نہیں آتی بلکہ

زیرِ آب گویا اک ہلکی ہلکی نیلگوں روشنی کی طرح اندر ہی اندر جھلکتی نظر آتی ہے، چھپا جو نگینے کے سینے سے پھوٹ کر نکلے اُس نور سے کہیں بہتر ہے جو خوبصورت جملوں سے مستعار لی جائے۔

عباس اپنے آپ کو اشتراکی سمجھتے ہیں۔ میرے خیال میں وہ اشتراکی نہیں ہیں۔ کبھی اپنے آپ کو کانگریسی بھی کہتے ہیں۔ میرے خیال میں وہ کانگریسی بھی نہیں ہیں۔ اُن کا شمار مسلمانوں میں ہوتا ہے۔ میرے خیال میں وہ محض مسلمان بھی نہیں ہیں۔ وہ حالی کے خاندان سے ہیں اور مسلم تہذیب کی بہترین روایات کے علمبردار ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہندو تمدن کے بہترین اوصاف بھی اُن میں پائے جاتے ہیں۔ گذشتہ آٹھ سو سال میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے میل جول سے اس ملک میں جو اک مشترک تہذیب، کلچر، زبان، لباس اور رقومیت کا تصور پیدا ہوا تھا، عباس اُس کے بہترین مظہر ہیں۔ اُن کی نگاہیں صرف ہندوستان اور پاکستان تک ہی محدود نہیں، اُن کے اعتقادات بین الاقوامی ہیں۔ وہ ہر مسئلہ کو عقلیت اور انسانی بہتری کے زاویہ نگاہ سے دیکھتے ہیں اور اگر اس میں کوئی کمی، نقص یا خامی دیکھتے ہیں تو بلا تکلف اُس کا اظہار بھی کر دیتے ہیں۔ اشتراکیوں، لیگیوں، کانگریسیوں، ترقی پسندوں، نا ترقی پسندوں سے اختلافِ رائے رکھنے کے باوجود وہ ہر اُس جماعت کے ساتھ اُس مسئلہ پر کام کرنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں جس میں انہیں انسانیت پسندی کی تصویر نظر آئے۔ اُن کے خلوص اور اُن کی ذاتی دیانت کے دوست دشمن سب ہی معترف ہیں۔ مگر میں اس وقت اُن کی شخصیت کے بارے

میں کچھ اور نہیں کہنا چاہتا، اس کام کو کسی دوسرے کے لئے اٹھا رکھتا ہوں۔ آخر میں صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ عباس مجھے بہت پسند ہیں، کیونکہ اُن کی شخصیت میں مجھے اپنی تصویر نظر آتی ہے۔ وہ میری طرح گنجے ہیں، میری طرح کوتاہ قد ہیں، میری طرح اک عجیب بے ہنگم چال سے چلتے ہیں۔ ہاں ایک بات میں وہ مجھ سے ضرور الگ ہیں۔ اُن کے ہونٹوں پر اک عجیب سی مسکراہٹ ہے۔ ایسی مسکراہٹ میں نے کہیں نہیں دیکھی۔ یعنی مسکرانے پر بھی اس مسکراہٹ میں آنسوؤں کی نمی ہے۔ گویا یہ مسکراہٹ ابھی رو دے گی۔ کہیٔ انجانی۔ اَن دیکھی اَن بوجھی حسرتوں کا مزار ہے یہ مسکراہٹ۔ ایسی حسرتیں جو ابھی انسانی سینے میں پیدا بھی نہیں ہوئیں۔ کسی موہوم چاہت کی سلگتی ہوئی آرزو، افق کے پار کسی نئی انسانیت کے مستقبل کی نازک تصویر، کہکشاں کے دودھیا راستے پر کسی نوزائیدہ ستارے کا سفر...... نہ جانے یہ حسرتیں کیا یاد دلاتی ہیں، یہ دل دوز تبسم کیا ہے؟ عباس کے حسین افسانے آپ کو اس سوال کا جواب دیں گے۔

⁂

پاؤں میں پھول

خواجہ احمد عباس

مکتبۂ سلطانی بمبئی

پہلا ایڈیشن ..... ایک ہزار ۱۹۴۸ء

قیمت: دو روپیہ آٹھ آنہ

عہ/۸

ناشر

مکتبۂ سُلطانی

ابراہیم رحمت اللہ روڈ۔ بمبئی ۳

پرنٹر و پبلشر

سُلطان حسین تاجر کُتب نے اپنے سلطانی فائن آرٹ لیتھو اینڈ پرنٹنگ پریس
بھنڈی بازار بمبئی ۳ سے شائع کیا

کرشن چندر

تعارف

خواجہ احمد عباس کے افسانے جنس کے محور پر نہیں گھومتے۔ جنس کا ذکر ان کے ہاں ضمناً ہے۔ کسی سماجی مسئلے یا معاشی الجھن یا سیاسی امور کے بیان میں جنس کا ذکر آ جائے تو آ جائے، وہ بھی اگر اس کی ضرورت پڑے تو، ورنہ نہیں۔ ان کے افسانوں میں جنسی حدت بہت کم ہے۔ معشوق کا سراپا مشکل ہی سے ملے گا۔ ایسی تشبیہیں اور استعارے بھی نظر نہیں آتے جن کا اطلاق کم از کم اس دنیا کی عورتوں پر نہیں ہوتا۔ جنس کے معاملے میں عباس انسانی قدروں کی طرف جھکتے نظر آتے ہیں (زیادہ گھٹتے)۔ آسمانوں کی طرف نہیں اڑتے۔ مبالغے پر حقیقت کو ترجیح دیتے ہیں، جذباتیت پر عقلیت کو، خوبصورتی پر انسانیت کو۔ انھیں معلوم ہے کہ انسان محض جنس نہیں ہے، وہ مرکب ہے مختلف جذبات و احساسات کا، مجموعہ ہے متضاد

جذبات کا، اُس کے خمیر میں مختلف قوتیں کام کرتی ہیں اور اُس کے مزاج کی ترکیب میں سماجی و معاشی ماحول، وراثت، تربیت اور اقتصادیات کے پس منظر کو بڑا دخل ہے۔ انسان اور اُس کے سماج کے متعلق عباس کا نظریہ سائنسی ہے، رومانی نہیں۔ مشینی ہے، سائنسی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ایک ایسے سماج میں جو ابھی سائنسی ہے صنعتی نہیں، جو عقل کی بجائے توہمات پر زیادہ یقین رکھتا ہے اور جو جنسی محبت کو رومانی عینک سے دیکھنے کا عادی ہے، عباس کے افسانے ابھی تک شک و شبہ کی نظروں سے دیکھے جاتے ہیں۔ عباس جاہلوں، جذباتیوں اور اعتقاد پرستوں کے افسانہ نگار نہیں ہیں۔ وہ پڑھے لکھے باشعور، بالغ اذہان کے افسانہ نگار ہیں۔ وہ افسانہ نگاروں کے افسانہ نگار ہیں۔ وہ اپنی تحریروں میں ماضی اور حال سے آگے جاکر مستقبل کی تعمیر کے متعلق زیادہ سوچتے ہیں۔ اُن کا ادب صنعتی انقلاب کے فروغ کا ادب ہے۔ اور جوں جوں ہندوستان میں اس انقلاب کو تقویت حاصل ہوگی۔ عباس کی تحریروں کی مانگ بڑھتی جائے گی۔ اور اگر کبھی مخالف انقلاب آیا اور فسطائیت کے اندھیرے نے ہمیں گھیر لیا تو عباس کی تحریریں سب سے پہلے جلائی جائیں گی۔

عباس مستقبل کے متعلق زیادہ سوچتے ہیں۔ کہیں اس سے آپ یہ اندازہ نہ لگائیں کہ وہ حال سے بے بہرہ ہیں۔ حال کے دقیق مطالعے کے بغیر مستقبل کے متعلق اشارے نہیں کیے جا سکتے۔ جہاں تک حال کے مشاہدات اور تجربات کا ذکر ہے عباس بے حد ذکی الحس واقع ہوئے ہیں۔ اس معاملے میں اُن کی صحافی زندگی نے بھی اُنھیں بڑی مدد پہنچائی ہے۔ اس ملک میں جہاں

اخبار مبنی تضییع اوقات میں داخل ہے۔ جہاں تنقیدیہ مضامین کے علاوہ اور کسی تحریر کا شمار ادب میں نہیں ہو سکتا، وہاں عباس کی جرأت یقیناً قابلِ احترام ہے کہ وہ ہر نئے موضوع پر کچھ نہ کچھ ضرور لکھ لیتے ہیں جس کا شمار اپنے حسنِ بیان اور قوتِ تخلیق کے اعتبار سے سچے ادب میں ہو سکتا ہے جنگ ہو یا فتح ہو۔ آزادی کا دن ہو یا کشمیر کی لڑائی ہو، یا بمبئی کا فرقہ وارانہ فساد ہو یا راشننگ کا جھگڑا ہو، ان کے افسانے ہر موضوع کو سمو کر ایک ایسی دلکش کیفیت پیدا کر دیتے ہیں جو ادبی بھی ہے اور ابدی بھی۔ یعنی وقتی موضوعات پر قلم اٹھانے کے بعد وہ اپنی تحریروں میں اُن پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہیں کہ افسانہ آج بھی دلچسپ معلوم ہوتا ہے اور آج سے بیس سال بعد بھی دلچسپ معلوم ہوگا۔ اخبار کی رپورٹ میں اور ادب میں یہی فرق ہے۔ عباس کی تحریروں میں فوری تاثر اور مستقل تاثر دونوں ملتے ہیں (ایک پائیلی چاول)

مجھے عباس کے افسانوں میں جو بات سب سے زیادہ پسند ہے وہ دوسروں کو سب سے زیادہ ناپسند ہے۔ یعنی اُن کا اندازِ نگارش کم اس کی بےمثال سادگی اور سلامت۔ منٹو کے ہاں مرعوب کُن شوخی کی نمود ہے، عصمت کے جملے اپنے موضوع سے قطع نظر بڑے شستہ بڑے منجھے ہوئے جاگیردارانہ رکھ رکھاؤ کے حامل ہوتے ہیں۔ بیدی کے ہاں متین رنگ غالب ہے۔ اور اپنے ہاں بھی اُسی اندازِ نگارش کے نمونے ملتے ہیں جو جاگیردارانہ ماحول میں نہایت مناسب اور بھلے معلوم ہوتے ہیں لیکن جو صنعتی دور کی ترجمانی کے لئے

زیادہ موزوں نہیں۔ اس اندازِ نگارش اور عباس کے مسائل میں وہی فرق
ہے جو ہارڈی اور ہیمنگ وے میں ہے۔ جو TESS اور FOR WHOM THE BELL TOLLS.
میں ہے۔ میں جب اپنے افسانے پڑھتا ہوں اور عصمت، بیدی اور منٹو کے،
تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم لوگ اک نہایت خوب صورت رتھ پر بیٹھے چلے
جا رہے ہیں اور عباس ہوائی جہاز میں سفر کر رہا ہے۔ اپنے ہاں شعریت ہے
خوب صورتی ہے، بیل منقش ہیں۔ چھتری مطلّا ہے، گھوڑوں کے گلے میں نقرئی
گھنٹیاں ہیں، لیکن چال میں قیامت کی سست رفتاری ہے، اور سڑک کچی
ہے، جگہ جگہ ہچکولے لگتے ہیں۔ لیکن عباس کی تحریروں میں کہیں ہچکولے
نہیں ہیں۔ سڑک صاف سیدھی اور پختہ ہے اور قلم میں ربڑ کے ٹائر لگے ہوئے
ہیں۔ ہوا کی روانی اور پرواز کی تیز رفتاری دونوں اس میں موجود ہیں۔
ظاہر ہے کہ موجودہ دور اور آنے والے زمانے کے مسائل ہم رتھ میں بیٹھ
کر نہیں طے کر سکیں گے۔ اس کے لئے ہمیں فضائی پرواز ہی سے کام لینا پڑیگا
شعریت کو کم کرنا ہوگا اور جاگیردارانہ تکلفات کو خیرباد کہنا ہوگا کہ جمہوریت
کا تقاضہ بھی ہے کہ ادیب زیادہ سے زیادہ صاف، آسان اور سلیس
زبان استعمال کریں جو جمہور کی سمجھ میں آسکے۔ اُسے بھاری بھرکم الفاظ
سے مرعوب کرنے کی کوشش نہ کریں۔ مغرب میں تو ادب کے ڈانڈے بلند
صحافت سے ملتے جا رہے ہیں اور رپورتاژ کو فروغ حاصل ہو رہا ہے۔ جملے
چھوٹے چھوٹے اور سلیس تر ہوتے جا رہے ہیں لیکن اُن کی فکری رفتار تیز تر
ہوتی جا رہی ہے، جیسے اُنھیں پر میسّر آ گئے ہوں۔ اپنے ہاں آپ کو

یہ رنگ صرف عباس کے ہاں ملے گا۔ دوسروں کے ہاں اس سے بہت کم۔ یہ تضاد تو مغرب میں بھی ہے۔ اس وقت برطانیہ سے زیادہ امریکہ میں اور فرانس سے زیادہ روس میں آپ کو یہ اندازِ نگارش ملے گا، کیونکہ جہاں مشینی دَور کی دھڑکن تیز ہے وہاں کے ادیبوں کی زبان بھی زیادہ نئی، مختصر اور تیز رفتار ہے۔ وہاں زندگی کی لے تیز ہو چکی ہے۔ زیادہ باتیں بنانے کا وقت نہیں۔ لوگ مبہم انجھاوے پسند نہیں کرتے۔ وہ سیدھا، صاف، براہِ راست اندازِ نگارش زیادہ پسند کرتے ہیں۔

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ عباس سادگی اور سلاست پر حسن اور شعریت کو قربان کر دیتے ہیں۔ حسن اور شعریت کے وہ بھی قائل ہیں اور اُسے سچے ادب کے اوصاف میں شمار کرتے ہیں، لیکن وہ ظاہری حسن اور ظاہری شعریت کے پرستار نہیں۔ اُن کے خیال میں محض خوبصورت جملوں سے، خوبصورت ادب کی تخلیق نہیں ہوتی۔ وہ حسن اور شعریت کی تخلیق ایسے ادب میں دیکھتے ہیں جو موضوع اور اندازِ نگارش کے باطنی امتزاج سے پیدا ہوتا ہے۔ وہ فقروں کے رنگ و روغن کے قائل نہیں۔ وہ موضوع کی لے کو دیکھتے ہیں جو موجودہ دَور میں اکثر و بیشتر تلخ ہے اور تیز رفتار ہے، اور پھر وہ اپنی زبان سے فوراً بھڑک لباس اتار دیتے ہیں، اور پھر اُن کی زبان اور اُن کے جملے موضوع سے اس طرح ہم آہنگ ہو جاتے ہیں کہ موضوع کی رفتار جملوں کی رفتار بن جاتی ہے اور موضوع کا رنگ جملوں کا رنگ بن جاتا ہے۔ اور اس طرح جو نئے حسن اور نئی شعریت کی تخلیق ہوتی ہے وہ جملوں کے ادبر نہیں آتی بلکہ

زیرِ آب گویا اک ہلکی ہلکی نیلگوں روشنی کی طرح اندر ہی اندر جھلکتی نظر آتی ہے، جیسا جو نگینے کے سینے سے پھوٹ کر نکلے اس نور سے کہیں بہتر ہے جو خوبصورت جملوں سے مستعار لی جائے۔

عباس اپنے آپ کو اشتراکی سمجھتے ہیں۔ میرے خیال میں وہ اشتراکی نہیں ہیں۔ کبھی اپنے آپ کو کانگریسی بھی کہتے ہیں۔ میرے خیال میں وہ کانگریسی بھی نہیں ہیں۔ اُن کا شمار مسلمانوں میں ہوتا ہے۔ میرے خیال میں وہ محض مسلمان بھی نہیں ہیں۔ وہ حالی کے خاندان سے ہیں اور مسلم تہذیب کی بہترین روایات کے علمبردار ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہندو تمدن کے بہترین اوصاف بھی اُن میں پائے جاتے ہیں۔ گذشتہ آٹھ سو سال میں ہندو اور مسلمانوں کے میل جول سے اس ملک میں جو اک مشترک تہذیب، کلچر، زبان، لباس اور قومیت کا تصور پیدا ہوا تھا، عباس اُس کے بہترین مظہر ہیں۔ اُن کی نگاہیں صرف ہندوستان اور پاکستان تک ہی محدود نہیں، اُن کے تصورات بین الاقوامی ہیں۔ وہ ہر مسئلہ کو عقلیت اور انسانی بہتری کے زاویۂ نگاہ سے دیکھتے ہیں اور اگر اس میں کوئی کمی، نقص یا خامی دیکھتے ہیں تو بلا تکلف اس کا اظہار بھی کر دیتے ہیں۔ اشتراکیوں، لیگیوں، کانگریسیوں، ترقی پسندوں، نا ترقی پسندوں سے اختلاف رائے رکھنے کے باوجود وہ ہر اُس جماعت کے ساتھ اُس مسئلہ پر کام کرنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں جس میں انہیں انسانیت پسندی کی تصویر نظر آئے۔ اُن کے خلوص اور اُن کی ذاتی دیانت کے دوست دشمن سب ہی معترف ہیں۔ مگر میں اس وقت اُن کی شخصیت کے بارے

میں کچھ اور نہیں کہنا چاہتا، اس کام کو کسی دوسرے کے لئے اٹھا رکھتا ہوں۔ آخر میں صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ عباس مجھے بہت پسند ہیں، کیونکہ اُن کی شخصیت میں مجھے اپنی تصویر نظر آتی ہے۔ وہ میری طرح گنجے ہیں، میری طرح کوتاہ قد ہیں، میری طرح اک عجیب بے ہنگم چال سے چلتے ہیں۔ ہاں ایک بات میں وہ مجھ سے ضرور الگ ہیں۔ اُن کے ہونٹوں پر اک عجیب سی مسکراہٹ ہے۔ ایسی مسکراہٹ میں نے کہیں نہیں دیکھی۔ یعنی مسکرانے پر بھی اس مسکراہٹ میں آنسوؤں کی نمی ہے۔ گویا یہ مسکراہٹ ابھی رو دے گی۔ کئی انجانی۔ اَن دیکھی اَن بوجھی حسرتوں کا مزار ہے یہ مسکراہٹ۔ ایسی حسرتیں جو ابھی انسانی سینے میں پیدا بھی نہیں ہوئیں۔ کسی موہوم چاہت کی سلگتی ہوئی آرزو، انوں کے پار کسی نئی انسانیت کے مستقبل کی نازک تصویر، کہکشاں کے دودھیا راستے پر کسی نوزائیدہ ستارے کا سفر...... نہ جانے یہ حسرتیں کیا یاد دلاتی ہیں، یہ دل دوز تبسم کیا ہے؟ عباس کے حسین افسانے آپ کو اس سوال کا جواب دیں گے۔

⁂

پاؤں میں پھول

میرے دوست رام کشن کا شمار ہندوستان کے اچھے ڈائرکٹروں میں ہوتا ہے۔ دس برس سے فلمی دنیا میں ہے۔ اپنے کام میں ہوشیار ہے اور درجنوں چوٹی کے اداکار اس کی فلموں میں کام کر چکے ہیں۔ سب سٹوڈیو والے اس کی عزت کرتے ہیں۔ مگر اس میں بس ایک کمزوری ہے۔ وہ یہ کہ کوئی فیصلہ خود نہیں کر سکتا جب تک آدھے درجن دوستوں یا جاننے والوں سے مشورہ نہ کرے۔ بدقسمتی سے میں بھی ان میں سے ایک ہوں۔ ہر چوتھے پانچویں روز مشوروں کی کھچڑی پکتی ہی

اور رام کشن صاحب کی بھرّائی ہوئی آواز سنائی دیتی ہے۔

"ارے بھائی میں ہوں رام کشن"

"ہاں۔ ہاں وہ تو میں سمجھ ہی گیا۔ کہو کیا کام ہے؟"

"شام کو فرصت ہو تو ذرا ادھر سے ہوتے جانا۔ ایک نئی کہانی آئی ہے۔ چاہتا ہوں تم بھی ذرا سن لینے"

اگر نئی کہانی نہیں تو کسی نئی گانے والی کی آواز کا ٹسٹ ہے۔ یا سٹوڈیو میں کوئی نیا سیٹ لگا ہے۔ یا فلم کے لئے کسی ناچ کا ریہرسل ہے یا تاریخی فلم کے لئے ہیروئن کے کپڑے یا زیور تیار ہو کر آئے ہیں۔ اور ڈائرکٹر رام کشن ان کے بارے میں فیصلہ نہیں کر سکتے جب تک زید، بکر، عمر، گوپال، ونود اور مدہن کی رائے نہ معلوم ہو جائے۔

ہاں تو کوئی سال بھر کا ذکر ہے کہ ایک دن میں دفتر میں "آخری صفحہ" لکھنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا کہ ٹیلیفون کی گھنٹی بجی اور ایک جانی بوجھی آواز سنائی دی۔

"ارے بھائی میں ہوں رام کشن"

"بولو کیا بات ہے؟"

"شام کو فرصت ہو تو ذرا ادھر ہو جانا ایک معاملہ میں مشورہ کرنا ہے"

"آخر کس معاملے میں؟"

"یہ جب آؤ گے تب بتاؤں گا۔ رات کا کھانا میرے ساتھ ہی کھانا"

اور ٹیلیفون کا سلسلہ بند کر دیا گیا۔

خیر صاحب، شام کو رام کشن کے فلیٹ پر پہنچے۔ دیکھا کہ داؤ دپر بلی، وسنت دادرکر اور شنکو رپہلے سے موجود ہیں اور چائے اڑا رہے ہیں۔ میں نے کہا کیوں بھائی لوگو۔ آج کون سی نئی آفت آئی ہے کہ رام نے ہم سب کو بلایا ہے۔ شنکو رنے جواب دیا: یہ رام ہی سے پوچھنا۔ وہ اُجلے کپڑے پہن کر آتا ہے، اور میں نے شنکو ر کے نیلی دھاری والے نیلے سوٹ کو جو دیکھا تو سمجھ گیا کہ کام جو کچھ بھی ہو اس میں کسی لڑکی کا دخل ضرور ہو گا۔

رام آیا تو سفید کلپ لگے ہوئے چکن کے کرتے، سفید ڈھیلے پائجامے اور سفید چپلوں میں ملبوس، بال کنگھا کئے ہوئے۔ میں نے کہا "خیریت تو ہے؟ آج کس کے قتل کا سامان ہے؟"

تب یہ بھید کھلا کہ رام کو اپنے نئے فلم "معصوم قاتل" کے لئے ایک ڈانسر یعنی ایک رقاصہ۔ یعنی ایک ناچنے والی کی تلاش تھی۔ اور کیونکہ جتنی مشہور و معروف ناچنے والیاں فلموں میں کام کرتی ہیں وہ سب دوسرے سٹوڈیوز میں کام کر رہی تھیں یا روپیہ زیادہ مانگتی تھیں یا بمبئی سے باہر گئی ہوئی تھیں یا بہت موٹی ہو گئی تھیں یا بہت دُبلی ہو گئی تھیں .... غرض مطلب یہ ہے کہ ایک نئی ناچنے والی کی تلاش تھی۔ اور اس غرض سے یہ قافلہ روانہ ہونے والا تھا!

کسی کم فلموں میں آپ نے ان نڈر اور جیوٹ شکاریوں کو دیکھا ہوگا جو افریقہ کے جنگلوں میں شیر کے شکار کو جاتے ہیں۔ کس طرح کیل کانٹے سے

درست ہو کر نکلتے ہیں! ایک کاندھے پر بندوق دوسرے پر رائفل۔ پیٹی میں چھرا۔ گلے میں دوربین لٹکی ہوئی۔ سر پہ خوفناک قسم کا ٹوپ۔ پاؤں میں موٹے تلے کے اونچے اونچے بوٹ۔ بس کچھ اسی طرح سے فلم والے "نئے چہروں" کی تلاش میں نکلتے ہیں۔ فرق یہ ہے کہ یونیفارم ذرا مختلف ہوتی ہے۔ تلوار بندوق کے بجائے جیبوں میں پارکر یا شیفرز کے فاؤنٹن پن رکھے جاتے ہیں تاکہ شکار پھنستے ہی اس سے کنٹراکٹ پر دستخط کرا لئے جائیں۔ کارتوسوں کے بجائے سگرٹوں کے ڈبے ہوتے ہیں۔ بٹوے میں دو تین سو روپے والے نوٹ اور دس بارہ دس روپے والے نوٹ ہوتے ہیں۔ آنکھوں میں جستجو اور دلوں میں کسی اچھے "شکار" پھنسنے کی امید ہوتی ہے۔

جنگلوں میں شیر کے شکار کو جائیے یا فورا سس روڈ پر ایک "نئے چہرہ" کی تلاش میں ایک "گائیڈ" کی مدد لازمی ہے۔ وہ گائیڈ یعنی راہبر یعنی وہ معتبر انسان جو جنگل کے ہر راستے اور پگڈنڈی سے باخبر ہو، جو دور سے شکار کو سونگھ لے اور جو جنگل کے ہر جانور کی عادات وخصلات، کمزوریوں اور چالاکیوں سے اچھی طرح سے واقف ہو۔ رام کشن کی موٹر فورا س روڈ کے جنگل۔ یا کہنا چاہئے جنگلوں میں داخل ہی ہوئی تھی کہ نہ جانے کہاں سے [illegible] ایک انسان چلتی موٹر کے پائیدان پر چڑھ پڑا۔ اس کی ہیئت کذائی [illegible] کہہ رہی تھی کہ اس کا پیشہ کیا ہے۔

"کیوں صاحب۔ لڑکیاں چاہئیں؟ [illegible]" [illegible]

[illegible] اس انداز سے آنکھ ماری کہ [illegible] کے رام کشن کا مقول سے [illegible]

سٹیرنگ وھیل پھسل گیا اور روشنی کے کھمبے سے ٹکر ہوتے ہوتے بچی۔ رام نے
خیریت اسی میں سمجھی کہ موٹر روک کر بات کی جائے۔

"دیکھو میاں۔ ہمیں ایک ناچنے والی چاہیے۔ فلم کے لئے سمجھے۔ اچھی
شکل ہو اور ناچتی بھی اچھا ہو۔"

"تو چلئے میرے ساتھ۔ عین آپ کے مطلب کی لڑکی آج ہی آئی ہے۔
ناچ میں سادھنا بوس اور آزوری کو مات کرتی ہے"

"مگر شکل و صورت کیسی ہے؟" شکور نے جلدی سے پوچھا۔

"حور کا بچہ ہے صاحب۔ بس نسیم اور دینا کا مجموعہ سمجھ لیجئے"

ایک بدبودار زینے کی سیڑھیاں طے کرتے ہوئے "کوٹھے" پر پہنچ
تو دیکھا کہ جس کو ہمارے گائیڈ صاحب "حور کا بچہ" اور "نسیم اور دینا کا
مجموعہ بتا رہے تھے وہ پھیکے شلجم کی رنگت کی کم از کم تیس سالہ طوائف تھی
جو فلمی ناچوں کی بھدی نقل اتار سکتی تھی۔ نام اب بھول گیا ہوں۔ شاید پریم لتا
یا پریم بالا تھا۔ مگر یہ کہانی اس پریم لتا یا پریم بالا یا جو کچھ بھی اس کا نام تھا
کے متعلق نہیں ہے۔ نہ ان چھ موٹی دبلی کالی سانولی چیچک منہ داغ پستہ قد
بلند قامت ناچنے والیوں کے متعلق جن کے ہاں یکے بعد دیگرے ہمارا "گائیڈ"
ہمیں لے گیا۔ نہ آپ کو اس سے کچھ دلچسپی ہو سکتی ہے کہ ایک کوٹھے پر جو
پہنچے تو میں نے دیکھا کہ طبلچی پانی پت کا ایک ڈوم ہے اور اس ڈر سے کہ یہ
وہاں جا کر سب سے کہے گا۔ میں اپنے ساتھیوں کو چھوڑ کر الٹے پیروں بھاگا
اور نہ اس سے بھی آپ کو کیا غرض کہ ان کی مختلف تھالیوں میں رام گڑھ کے دوسرے

میں پچیس روپے ڈالنے پڑے اور میں دل میں سوچتا رہا کہ سٹوڈیو کا خزانچی اس رقم کو کس مد میں لکھے گا۔

قصہ مختصر یہ ہے کہ بارہ بجے "گائیڈ" صاحب سے صاف صاف کہہ دیا کہ اب ہم کسی "چور کے بچے" کو دیکھنے کے لئے تیار نہیں ہیں اور نہ ہمیں کسی "مادھوری اور سلوچنا کے مجموعے" میں دلچسپی ہے۔ مگر وہ بھی عجب لیچڑ انسان تھا۔ کہنے لگا "اچھا اب میری خاطر ایک اور جگہ چلئے یہ بھی آپ کو ناپسند ہو تو جو چور کا حال سو میرا حال۔ مگر کانگریس ہاؤس چلنا پڑے گا"۔

"کانگریس ہاؤس؟" ہم سب نے ششدر ہو کر کہا۔ یا منظہر العجائب کیا جب سے پولیس نے کانگریس ہاؤس پر قبضہ کیا ہے وہاں یہ سب حرکتیں ہوتی رہیں؟

"گائیڈ" نے ہماری حیرانی دور کرنے کے لئے کہا "میرا مطلب یہ ہے کہ کانگریس ہاؤس کے پاس۔ کینیڈی برج کے نیچے"۔

وسنت واڈکر کو بھوک لگ رہی تھی۔ اس کی رائے تھی کہ اب زیادہ تلاش بے کار ہے۔ میں بھی کچھ اسی خیال کا تھا۔ مگر رام کشن کا سیٹ رکا ہوا تھا اور ناچنے والی نہ ملنے کی وجہ سے فلم مکمل ہونے میں دیر ہوتی جا رہی تھی۔ رہے شکور اور داؤد تو وہ رات بھر چکر لگانے کو تیار تھے۔۔ ۔۔ یا جب تک رام کشن کی جیب میں پان کی تھالیوں میں روپے دو تھے!

"چلو یہی ۔ یہ بھی سہی ۔ مگر اس کے بعد سیدھے گھر واپس" میں نے کہا اور ہماری موٹر لیمنگٹن روڈ ہوتی ہوئی ، کانگریس ہاؤس کے سامنے سے گزر کر ایک اندھیری گلی میں رک گئی ۔

اونچی پانچ منزلہ عمارت تھی ۔ نئی بنی ہوئی ۔ کھلی ہوئی کھڑکیوں میں سے گانے کی آواز آ رہی تھی ۔ گھونگھرو بھی چھنک رہے تھے ۔ دو چار فوجی بے تابانہ ادھر سے اُدھر ٹہل رہے تھے ۔ ایک ہوٹل کا "باہر والا" لپکا ہوا سوڈے کی بوتلیں لئے اوپر جا رہا تھا ۔ کسی کمرے میں کوئی عورت بے تحاشا قہقہہ مار کر ہنسے جا رہی تھی ، جیسے اس کو ہنسی کا دورہ پڑ رہا ہو ۔ اس قہقہے کی آواز کو چیرتی ہوئی کسی اور عورت کی چیخ سنائی دی ۔ مگر فوراً ہی بجلی کی ریل کی خوفناک گڑگڑاہٹ ، قہقہے اور چیخ دونوں پر چھا گئی ۔ جب ریل گزر گئی تو گھونگھرو بدستور چھنک رہے تھے ، طبلہ بدستور کھڑک رہا تھا اور کوئی بے سُری آواز گا رہی تھی "ہماری گلی آنا" اور اس عرصہ میں ہم سب سیڑھیوں کا ایک لامتناہی سلسلہ طے کر رہے تھے ۔

دروازہ کھلا ہوا تھا ۔ کمرے میں فرش پر چاندنی بچھی ہوئی تھی جو کبھی نہ کبھی ضرور سفید رہی ہوگی ۔ دیوار کے سہارے گاؤ تکئے لگے تھے ۔ ایک بوڑھے ملازم نے "آیئے آیئے" کہہ کر ہمارا استقبال کیا اور ہم جوتے اتار کر بیٹھ گئے ۔ مگر کمرہ خالی تھا ۔ ایک کونے میں ہارمونیم کی پیٹی پڑی تھی ۔ دوسرے میں طبلوں کی جوڑی ۔ ایک میلے سے پردے کے پیچھے دوسرے کمرے میں جانے کا دروازہ تھا ۔ ہمارا "گائیڈ" بے تکلفی سے دوسرے

کمرے میں چلا گیا اور تھوڑی دیر میں وہاں سے پان کھاتا ہوا آیا۔

"باہر گئی ہوئی ہے مگر ابھی آتی ہے۔ بس پانچ منٹ انتظار کرنا پڑیگا"

بوڑھا ملازم جس کی داڑھی مہندی سے رنگی ہوئی تھی اور جس کی آنکھوں میں کچھ عجیب افسردگی تھی پانوں کی تھالی لے کر آیا اور ہمارے سامنے رکھدی۔ اور پھر چپ چاپ چلا گیا۔

شکور نے کہا "یار کچھ عجیب احول ہے یہاں تو؟"

میں نے کہا "ہاں جیسے اس میلے پردے کے پیچھے کوئی پراسرار راز ہو"

داؤد نے کہا "یا کوئی ٹریجڈی ہو"

رام کشن نے کہا "تم سب پاگل ہو"

شکور نے کہا "اس بوڑھے ملازم ہی کو دیکھو۔ اس کی آنکھیں ۔ ۔ ۔ ۔"

"دکھنے آئی ہیں" رام کشن نے فقرہ پورا کیا۔

وسنت نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا "ساڑھے بارہ بجنے کو آئے۔ اب چلنا چاہئے۔ آخر کب تک انتظار کریں گے؟"

میں بھی اس کی تائید کرنے ہی والا تھا کہ پردے کے پیچھے سے ایک شخص برآمد ہوا۔ اور اس کے آتے ہی کمرے کی ساکت فضا میں ہلچل مچ گئی۔ اس شخص کا حلیہ تو معمولی تھا۔ درمیانہ قد۔ گہرا سانولا رنگ۔ چھوٹی چھوٹی مگر چمکیلی آنکھیں۔ داڑھی منڈی ہوئی۔ موٹی موٹی فوجی قسم کی مونچھیں۔ لمبے گھونگروالے بال جو تیل میں ڈوبے ہوئے تھے۔ بدن پر ایک لمبا سا تہمد اور سبز دھاری دار

سلک کی ممتیں۔ مگر اس کی گفتگو کا طریقہ کچھ عجیب تھا۔ جیسے مشین گن چل رہی ہو
اس طرح الفاظ کی گولیاں اس کے منہ سے چھوٹتی تھیں۔ میں نے چرب زبان
دکاندار بھی دیکھے ہیں اور فلم کے پبلسٹی والوں سے بھی میرا سابقہ پڑتا رہتا ہے۔
مگر ان حضرت کے سامنے وہ سب ہیچ تھے۔

"آداب عرض۔ آداب عرض۔ نمستے۔ بندگی۔ تشریف رکھئے۔ فرمائیے
کیا خاطر کی جائے؟ وِسکی برانڈی جو کہئے حاضر ہے۔ بیئر کا شوق ہو تو
وہ منگوائی جائے۔ آپ نہیں پیتے؟ خیر تو کچھ ٹھنڈا کچھ گرم۔ ارے او
سیتا...." اور جب افسردہ آنکھوں والا بوڑھا آیا تو اس سے
"ذرا پانچ لیمن تو لے آ۔ برف ڈلوا کر" اور ہم سے مخاطب ہو کر "آپ
چندرا کا ناچ دیکھنے آئے ہیں نا؟ معاف کیجئے انتظار کرنا پڑا۔ بات یہ ہے
کہ ابھی ابھی پولیس کلب میں ڈانس کر کے آ رہی ہے۔ بڑی تالیاں بجیں۔
خود پولیس کمشنر صاحب نے اپنے ہاتھ سے ہار پہنایا۔ پورے تین گھنٹے
ڈانس کرتی رہی۔ اب بھی بڑی مشکل سے چھٹکارا پا کے آ رہے ہیں ورنہ
وہ لوگ کب آنے دیتے تھے۔ پچھلے ہفتے ریڈیو کلب میں ڈانس کیا تھا۔
وہاں کوئی ہالی ووڈ کا ڈائرکٹر آیا ہوا تھا کہنے لگا۔ میڈم چندرا ہم تم کو
ہالی ووڈ لے جانا چاہتے ہیں۔ وہ تو آج کل جنگ کی وجہ سے جہازوں کا
آنا جانا رکا ہوا ہے ورنہ سب معاملے طے ہو چکا تھا۔ یہ سب تو اخباروں میں
بھی آ چکا ہے۔ آپ نے تو پڑھا ہو گا؟"

یہ سوال مجھ سے کیا گیا تھا۔ شاید اس نے بھانپ لیا تھا کہ میں

اخبار نویس ہوں۔ اس لئے جھوٹ مجھے ہی بولنا پڑا۔ "جی ہاں۔ یہ خبر تو سارے اخباروں میں آچکی ہے۔"

اتنے میں ایک عدد سیٹھ صاحب جو نشے میں چور تھے اور دو عدد ان کے ساتھی داخل ہوئے: "چندرا ادھر رہتا ہے؟" سیٹھ صاحب نے فرشش کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سوال کیا "ہم چندرا کا ڈانس دیکھنے مانگتا" مشین گن پھر چل پڑی "آئیے۔ آئیے۔ سیٹھ صاحب۔ نمستے۔ بندگی ادھر تکئے سے لگ کر بیٹھئے۔ چندرا کی تو قسمت جاگ اٹھی ہے آج کہ آپ تشریف لائے ہیں۔ ابھی حاضر ہوتی ہے۔ بات یہ ہے کہ گورنمنٹ ہاؤس میں ڈانس تھا۔ وہاں سے ابھی ابھی چلی آ رہی ہے۔ سرکاری معاملہ۔ انکار بھی تو نہیں کر سکتے۔ مگر سچ بات یہ ہے کہ یہ انگریز لوگ آرٹ کی قدر دانی بھی خوب کرتے ہیں۔ خود گورنر صاحب نے اپنے ہاتھ سے ہار پہنایا۔ جی ہاں اپنے ہاتھ سے . . . . . " وغیرہ وغیرہ۔ مشین گن چلتی رہی اور ہم سب حیرت سے اس کا منہ تکتے رہے اور داؤد نے میرے کان میں کہا "اس بار کوئی آیا تو معاملہ بادشاہ سلامت تک پہنچ جائے گا۔"

" آؤ بیٹی آؤ " میلے پردہ کو ایک جنبش ہوئی اور چندرا داخل ہوئی پیچھے پیچھے لمبی قلموں، باریک موچھوں والا ایک لمبا تڑنگا نوجوان سفید قمیص اور پتلون میں۔

چندرا! اگر آپ اس انتظار میں ہیں کہ میں اس کا بیان کچھ اس انداز سے کروں کہ "پردہ کو ایک جنبش ہوئی اور کمرے میں ایک بجلی سی

کوند گئی۔ ایک شعلۂ جوالہ رقص کرتا ہوا آ کھڑا ہوا۔ چندرا ایک عورت نہیں تھی وہ حسن و جوانی کا پیکر تھی۔ کلیوپیٹرا کا بے پناہ حسن، نورجہاں کی نزاکت، سیتا کی معصومیت، اس میں کیا کچھ نہ تھا ؟ تو آپ کو مایوس ہونا پڑے گا چندرا کو کسی طرح سے حسن کا پیکر نہ کہا جا سکتا تھا۔ باوجود پاؤڈر کے سانولی رنگت کھڑا لقشہ۔ بھاری نازک۔ نزاکت کے بجائے اس کی ساخت میں ایک قسم کی کرختگی تھی۔ اور معصومیت کے بجائے ایک خاص قسم کا پکا پن جو اس طبقے میں پایا جاتا ہے۔ پھر بھی وہ تھی جوان۔ شباب کا خمیر اس کے بدن میں ضرور تھا۔ عمر زیادہ سے زیادہ بیس برس کی ہوگی مگر وہ اس پودے کے مانند تھی جس کو پوری نشو و نما سے پہلے ہی زمین میں سے اکھاڑ کر ایک گملے میں لگا کر بند کمرے میں رکھ دیا گیا ہو۔ اس میں جوانی کا رنگ تھا، جوانی کی بُو باس تھی مگر جوانی کی تازگی اور شگفتگی نہیں تھی۔

چندرا سب کو سلام کر کے ایک بناوٹی حیا کے ساتھ فرش پر بیٹھ گئی۔ اب سیٹھ صاحب کو ہوش آیا۔ کچھ دیر اپنی آنکھیں اس پر گاڑنے کے بعد بولے "تم چندرا ؟ نائیں۔ تم چندرا نائیں۔"

چندرا بناوٹی شرم کو فی الحال بالائے طاق رکھ کر بناوٹی ہنسی ہنس پڑی۔ ہشین گرن کو پھر موقع مل گیا۔

"آپ بھی بڑے پُر مذاق آدمی ہیں، سیٹھ صاحب۔ مگر اکثر لوگ اسے نہیں پہچانتے۔ تعجب کرتے ہیں کہ سولہ برس کی عمر میں ناچ میں اتنا کمال کوئی کیسے حاصل کر سکتا ہے ؟ آج ہی پولیس کمشنر صاحب ... میرا

مطلب ہے گورنر صاحب کے سامنے تھالی کے کنارے پر ڈانس کرکے آئی ہے۔ دنگ رہ گئے سب ؟"

"تھالی کے کنارے پر ڈانس ؟ کمال ! کمال !" سیٹھ صاحب چہکے۔

" اجی جناب تھالی کے کنارے پر کیا تلوار کی دھار پر ڈانس کراؤنگا اس سے۔" اور پھر چلایا "سیتا۔ سیتا۔ ذرا وہ تلوار تو لے آنا۔"

سیتا جب تلوار لے کر آیا تو میں نے دیکھا کہ اس کی آنکھوں میں افسردگی ہی نہیں بلکہ پریشانی بھی تھی۔ پریشانی سے بھی زیادہ۔ جیسے کوئی بکرا قصائی کے لئے خود چھرا لئے چلا آرہا ہو۔ تلوار میان سے نکالی گئی تو اس کی چمکیلی دھار دیکھ کر سب دم بخود ہو گئے۔ کیا یہ لڑکی سچ مچ اس پل صراط پر قدم دھر سکے گی ؟

" دیکھا آپ نے۔ ایک دن چندرا اسی تلوار کی دھار پر ڈانس کرکے آپ کو دکھائے گی۔" اور پھر میان میں واپس رکھتے ہوئے " مگر آج نہیں۔ اس کے لئے تو ایک بڑا جلسہ کرنا پڑے گا۔ ڈانس کے بڑے بڑے ماہر استاد آئیں گے۔ کیا عجب ہے خود گورنر صاحب بہادر ـــــ میرا مطلب ہے پولیس کمشنر صاحب ـــــ بھی قدم رنجہ فرمائیں۔" اور پھر سیتا سے " لو یہ اندر رکھ آؤ۔" نہ جانے کیوں میری نظر پھر بوڑھے ملازم کے چہرے پر پڑ گئی۔ اس کی آنکھوں میں افسردگی بدستور تھی مگر ہلکی سی جھلک طمانیت کی بھی۔ جیسے قصائی نے بکرے کو ذبح کرنا ملتوی کر دیا ہو۔ اور بکرے کی آنکھوں میں پھر زندگی کی امید آ گئی ہو۔ یا یہ سب میرے دماغ کی

یمال آ رائی تھی ؟

سب کی فرمائش پر چندرا نے ناچنا شروع کیا۔ یہ تو فوراً معلوم ہوگیا کہ اس بے چاری نے اس فن کی کوئی تعلیم نہ پائی تھی۔ نہ اس کے رقص میں آرٹ تھا نہ تکنیک۔ نہ کوئی مدرا درست تھا نہ پاؤں کے توڑے۔ گھونگھروؤں کی جھنکار اکثر بے سُری ہو جاتی تھی۔ مگر اس کے باوجود وہ متی پیدا ایسی رقاصہ۔ اس کے بدن میں ایک عجیب دلفریب لچک تھی۔ اور وہ ہر جذبے کو اپنی آنکھوں سے ظاہر کرسکتی تھی۔ اس کے قدموں کی ٹھوکر میں ایک والہانہ پن تھا۔ ایک قدرتی آہنگ۔ اس کی آواز سریلی نہ تھی مگر بری بھی نہ تھی اور فلمی گیتوں کی نقل کرنے میں وہ کمال رکھتی تھی۔ اس کے علاوہ اس کی اداؤں میں ایک عامیانہ بے تکلفی ایک بازاری پن تھا جو اکثر فلمی ناچوں کی مقبولیت کا راز ہوتا ہے۔ رام کشن کو اپنے فلم کے لئے ایسی ہی ناچنے والی کی ضرورت تھی۔

"کیوں کیا خیال ہے ؟" رام نے داؤ دبریلی سے دھیمی آواز میں پوچھا۔

"چلے گی"

"تم کیا کہتے ہو ؟" خطاب مجھ سے تھا۔ میں ان معاملات میں داؤد کو استاد مانتا ہوں اس لئے میں نے بھی ہاں میں ہاں ملادی۔

چندرا گا رہی تھی "چھوٹی نیلی رنگا دوستیاں" نہ جانے اس کو کیسے معلوم ہوگیا تھا کہ ہمارے گروہ کا سردار رام کشن ہے۔ بار بار اس کے پاس جا کر گاتی تھی، آنکھ مارتی تھی، انداز دکھاتی تھی۔ اور

سیٹھ صاحب تھے کر دیکھ دیکھ کر جل رہے تھے۔ ایک دفعہ اس نے رام کے پاس آ کر جب " چولی نیلی رنگا دو سیّاں " کہا تو رام سے نہ رہا گیا اور اس نے کہا " تم آؤ تو میری جان۔ چولی بھی رنگا دیں گے اور لہنگا بھی "۔ جس پر بڑا قہقہہ پڑا۔ مگر سیٹھ صاحب نہیں ہنسے۔

ناچ ختم کر کے چندرا نے پان تقسیم کئے اور تھالی میں پندرہ بیس روپے جمع ہو گئے۔ سیٹھ صاحب کے پاس گئی تو انہوں نے فرمایا " اپنے ہاتھ سے کھلاؤ "۔ چندرا نے ناز سے گلوری اٹھائی اور سیٹھ صاحب کے منہ میں رکھ دی جس پر تھالی میں دس روپے کا اضافہ ہو گیا۔ مگر سیٹھ صاحب اتنے الطاف پر اکتفا کرنے والے نہ تھے۔ ہاتھ پکڑ کر چندرا کو بٹھا لیا اور نشہ سے لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں بولے " یہاں بیٹھو میری جان۔ ابھی جوان ہو جوانوں کے پاس جاتی ہو۔ ہمارے پاس آتی گھبراتی ہو۔ ایک دن تم بھی بوڑھی ہو جاؤ گی چندرا " اور ایک خوفناک قہقہہ لگا کر " چندرا! نائیں۔ تم چندرا نائیں "۔

میں گھبرایا کہ اب کوئی جھگڑا کھڑا ہوا اور اگر کسی چیز سے میں دور رہنا چاہتا ہوں تو وہ شرابیوں کی دھینگا مشتی ہے۔ مگر چندرا کا جواب سن کر میں دنگ رہ گیا اور مدہوش سیٹھ لاجواب۔ وہ بولی " سیٹھ صاحب جو جوان ہے وہ بوڑھا ضرور ہوگا۔ اور جو بوڑھا ہے وہ ایک روز ضرور مر جائے گا۔ نہ موت کے ڈر سے کچھ حاصل ہے نہ بڑھاپے کے خوف سے "۔ اور پہلی بار میں نے اس کی آنکھوں کی چمک میں ایک افسردہ گہرائی دیکھی اور اس کی آواز میں ایک عجیب

لگی محسوس کی جو بازاری بات چیت کی تفصیلی مٹھاس سے کہیں بہتر تھی۔ سیٹھ صاحب نے نشے میں کچھ سنا اور کچھ نہ سُنا گران کا تجربہ کار ہاتھ آپ سے آپ چندرا کی گداز برہنہ باہوں پر پہنچ گیا۔ چندرا وہاں سے سرک کر دُور بیٹھ گئی۔

"جھینپتی ہو؟" اور پھر سیٹھ صاحب نے ایک خوفناک قہقہہ مارا۔ "میری جان جب اوکھلی میں سر دیا تو دھمکوں کا کیا ڈر؟" اور پھر نہ جانے کیوں میری طرف ہٹ پڑے "کیوں مسٹر تم کیا کہتے ہو؟"

میرا جی نہ چاہتا تھا کہ کچھ جواب دوں۔ کون شرابی کے منہ لگے! مگر وہ بندۂ خدا میرے پیچھے ہی پڑ گیا۔ "بولو مسٹر کیا رائے ہے تمھاری؟"

"ٹھیک فرماتے ہیں سیٹھ صاحب آپ۔" میں نے تنگ آکر اسے ٹالنے کے لئے الل ٹپ جواب دیا "اگر کوئی چلتی ہوئی مشین میں ہاتھ ڈالے گا تو ضرور ہاتھ کٹ جائے گا۔"

"جی ہاں یہ چندرا کی آواز سن کر میں چونکا "جی ہاں اگر پاؤں ڈالے گا تو پاؤں کٹ جائے گا۔" یہ کہہ کر اس نے بلاتکلف لہنگے کو ٹخنوں سے اوپر اٹھا لیا۔ جہاں گھونگرو چمڑے کے تسموں سے کسے ہوئے تھے وہاں زخم پڑ گئے تھے۔ مرہم کے پھائے لگے تھے اور ایک ٹخنے پر پٹی بھی بندھی تھی۔

سیٹھ صاحب اشارہ پاکر تہمد والے آدمی کے ساتھ دوسرے کمرے میں کوئی کاروباری گفتگو کرنے چلے گئے۔ اب ان پتلی مونچھوں والے نوجوان صاحب کو بات کرنے کا موقع ملا۔ نہایت بے تکلفی سے بولے:

"چندر کچھ معلوم بھی ہے یہ صاحب کون ہیں؟ یہ ہیں ہمارے مشہور ڈائرکٹر رام کشن صاحب۔ جنہوں نے "نیا مجنوں" اور "کالی شلوار" جیسے فلم بنائے ہیں۔"

رام بیچارے کا سب بھانڈا پھوٹ گیا۔ حالانکہ اس نے "گائیڈ" سے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ ہرگز نہ ظاہر کیا جائے کہ ہم کسی فلم کمپنی کی طرف سے آئے ہیں۔ مگر اب تو مجبوری تھی۔ اور سب کا بھی تعارف کرانا پڑا۔ جب میری باری آئی تو رام نے اپنا بدلہ مجھ پر اتارنے کے لئے خوب بڑھا چڑھا کر تعریف کی اور کہا "ان کے مضمون اور کہانیاں تو آپ نے اخباروں رسالوں میں ضرور پڑھی ہوں گی۔" اور چندر رامے صاف جھوٹ بولا "جی ہاں کیوں نہیں۔" اور پھر انداز سے منہ بنا کر "ہم پر بھی ایک کہانی لکھ دیجیے نا۔"

مگر نیلی مونچھوں والے صاحب گفتگو کا رخ اپنی جانب موڑنے پر تلے ہوئے تھے "رام صاحب۔ خاکسار کو امرت ٹھاکر کہتے ہیں۔ میں بھی آپ کی طرح یو۔ پی ہی کا رہنے والا ہوں اور اب تو آپ کی دعا سے ہم پیشہ بھی ہوں۔"

"جی ..... آپ بھی ....؟"

"جی ہاں میں بھی اس ڈائرکشن لائن میں ہوں۔ پہلے فلم کا سینیریو لکھ رہا ہوں۔ کبھی فرصت ہو تو سنئے اور مشورہ دیجیے۔"

"کون سی کمپنی میں ہیں آپ؟"

"کام تو بہت سی کمپنیوں میں کیا ہے۔ پر بھات۔ بمبئی ٹاکیز۔ پربھات ..."

ابھی کچھ دنوں سے موہن میں تھا۔ اب نئی کمپنی کھلی ہے۔ اس کے لائسنس کا انتظار ہے۔"

"کہئے۔ کیا کاسٹ لے رہے ہیں؟ ذرا ہم غریبوں کا بھی خیال رہے۔" داؤد کو ٹھاکر صاحب کی ٹانگ گھسیٹنے کا موقعہ ملا تو وہ کیا چوکنے والا تھا۔

"کاسٹ میں مس چندرا تو ہوں گی ہی۔ ویسے میل لیڈ کے لئے سوچ رہا ہوں موتی لال کو لوں یا پرتھوی راج کو۔ ابھی طے نہیں کیا۔"

"آپ خود کیوں نہیں ہیرو کا پارٹ کر لیتے؟" شکور کم بولتا ہے مگر جب زبان کھولتا ہے تو نشانہ خطا نہیں جاتا۔

ممکن ہے بات آگے بڑھتی مگر اسی وقت سیٹھ صاحب تہمد والے صاحب کے ساتھ باہر آ گئے۔

"بیٹی۔ سیٹھ صاحب کو نمسکار کرو۔ وہ جا رہے ہیں۔"

"اچھا چندرا ہم جائینگا۔ کل رات کو آئینگا۔ بھولنا مت۔" یہ کہہ کر سیٹھ صاحب نے نہایت اطمینان سے چندرا کے گالوں کو کھینچا اور اپنے ساتھیوں کے سہارے لڑکھڑاتے ہوئے چل دئے۔

"مسینا ابا!" چندرا نے آواز دی "ذرا ایک گلاس پانی دینا" مسینا ابا! اور ابا پر اس قدر پیار کہ انداز! افسردہ آنکھوں والا بوڑھا ملازم کمرے سے باہر گیا ہی تھا کہ مشین گن پھر چل پڑی۔ "بڑا پرانا ملازم ہے ہمارا۔ بچپن میں چندرا کو گود کھلایا ہے اس لئے مسینا ابا مسینا ابا ہی کہتی ہے۔"

اور پھر موضوع بدلنے کے لئے " کہئے ڈائرکٹر صاحب کیا حکم ہے ؟ "

رام کشن نے فوراً مطلب کی بات چھیڑ دی " اپنی بیٹی کے فلم میں کام کرنے کے بارے میں کیا رائے ہے آپ کی ؟ "

" اجی کام کا تو اس کو بڑا شوق ہے اور یوں ٹرائیل کے طور پر موہن پکچرز کی فلم " ایرانی حور " میں سائڈ ہیروئن کا کام بھی کر چکی ہے۔ مگر اب میں نے طے کر لیا ہے کہ ہیروئن رول ہی ملے گا تب ہی بھیجوں گا۔ "

" ہیروئن رول ؟ " رام کشن نے زور دیتے ہوئے الفاظ دہرائے

" جی ہاں " اور پھر کچھ گھبرا کر کہ ایسا نہ ہو موقعہ ہاتھ سے نکل جائے۔ " مگر یہ تو اوروں کے لئے ہے۔ آپ جیسے قابل ڈائرکٹر کے ہاں تو کوئی اچھا کام مل جائے کافی ہے۔ "

" تو دیکھئے کوئی کام نکلا تو میں پروڈکشن منیجر کو بھیج دوں گا "

رام کشن جانتا تھا کہ روپے پیسے کی بات چیت کرنا اس کے بس کا کام نہ تھا " اچھا تو اب ہم چلتے ہیں "

وہ سین مجھے ہوبہو اب تک یاد ہے۔ ہم اٹھنے کی تیاری کر ہی رہے تھے کہ دروازے میں ایک نوجوان پھولوں کی ٹوکری لئے نظر آیا بیس بائیس برس کی عمر ہوگی۔ خاصا خوش شکل بھی تھا ٹوکری میں ہار، گلدستے اور بالوں میں لگانے کے ہلال نما گجرے جو " ڈینی " کہلاتے ہیں۔ چندرا پاؤں پسارے آدھی بیٹھی اور آدھی لیٹی تھی۔ ایک لمحے کے لئے پھول والا نوجوان اس کو دیکھ کر مبہوت سا رہ گیا۔ پھر گا کر بولا " بابو پھول والا آیا۔ ہار اور

گجرے اعلیٰ لایا ۔

چندرا نے تنک کر کہا "کچھ نہیں چاہئے۔"

" ایک بینی ہی لے لیجئے، بالوں کے لئے۔"

" دیکھتا نہیں پہلے ہی لگی ہے۔" اور چندرا نے اپنے جوڑے کو جھٹکی دی جہاں پھولوں کا نیم دائرہ بالوں کے گرد لگا ہوا تھا۔

" تو پھر پاؤں ہی میں باندھ لیجئے۔" اور یہ کہہ کر چشم زدن میں ٹوکری زمین پر رکھی اور اس میں سے سب سے اچھی "بینی" چندرا کے ٹخنے پر پازیب کی طرح باندھ دی۔ روزانہ ناچنے کی مشق نے ٹخنوں کو بڑا سڈول اور خوشنما بنا دیا تھا۔ اس کے گرد پھولوں کے گجرے نے ایک عجیب مگر دلکش کیفیت پیدا کر دی۔ پھول والے کی یہ حرکت اس قدر بے ساختہ اور بھولی تھی کہ سب کھکھلا کر ہنس پڑے اور وہ خود کھسیانہ ہو کر چل دیا۔ چندرا چلاتی رہی "پیسے تو لے جا۔"

خیر ہم چلے آئے۔ واپسی پر راستے میں حسب معمول فقرے چلنے لگے۔

" بھئی اس لڑکی کے تین ابا نکلے۔" رام کشن نے کہا "دلال ابا، سیٹھ ابا۔ ڈائریکٹر ابا۔"

داؤد فوراً " مادری" زبان پہ اتر آیا " اور تنبول کے تنبول ابا۔"

" اچھا یہ بتاؤ کہ یہ چندرا ہے کس کی بیٹی؟" میں نے سوال کیا۔

" طوائف کی بیٹی صرف اپنی ماں کی بیٹی ہوتی ہے۔" تنکو نے اپنا فلسفیانہ فیصلہ دیا۔

"میرے خیال میں سیتا کے تعلق سے ہے جو چندرا کی ماں کا ملازم رہا ہوگا اور بیٹی کے خیال سے پڑا ہوا ہے۔"

"تو دلال ابا سے کیا رشتہ داری ہے؟" ہم لوگ گویا جاسوسی ناول میں قاتل کا سراغ لگا رہے تھے۔

"معلوم ہوتا ہے دلال ابا نے چندرا کی ماں سے شادی کرلی ہے تاکہ بیٹی کی آمدنی پر قانونی حق ہو جائے۔"

"اور ڈائرکٹر ابا؟"

"یہ ایک فلم زدہ نوجوان معلوم ہوتا ہے جو اس تاک میں ہے کہ چندرا کے سہارے ڈائرکشن مل جائے۔ جانے نہیں جو کتنے ہی گدھے ایک جاذب نظر لڑکی کے طفیل ڈائرکٹر بن جاتے ہیں۔ دلال ابا ٹھاکر کو اس لیے شہ دے رہے ہیں کہ چندرا کو کسی فلم میں ہیروئن کا رول مل جائے روپیہ چاہے سیٹھ کی جیب سے آئے یا کسی فلم سٹوڈیو کی تجوری میں سے بہ حال دلال ابا کی جیب میں جانے والا ہے۔"

معاملہ بالکل صاف اور سیدھا تھا۔ چندرا شہد کا ایک قطرہ تھی جس پر بھن بھن کرتی ہوئی زہریلی مکھیاں منڈلا رہی تھیں۔ چندرا کا جسم روپیہ بنانے کی ایک مشین تھی جس پر ہر شخص قبضہ کرنے کی تاک میں تھا۔ مگر خود چندرا کیا تھی؟ یا وہ صرف ایک طوائف زادی تھی جو بچپن سے اس پیشے کے لیے ہی تیار کی گئی تھی —— چندرا۔ دلال ابا۔ سیتا۔ امرت ٹھاکر۔ شرابی سیٹھ —— ان سب کے کردار، ان سب کے اغراض و مقاصد

کھلے ہوئے تھے۔ جسم فروشی کی اس دنیا میں ان سب کی ایک جگہ تھی
لالچ اور شہوانیت کے اس ڈرامے میں وہ سب اہم کردار کر رہے تھے
مگر وہ پھول والا اور اس کی معصوم حرکت ۔ ۔ ۔ ان کا تعلق اس دنیا
اس ڈرامہ سے کیا تھا ؟

اس رات کو دیر تک میرے دماغ میں ایک تصویر گھومتی رہی۔
بیر پیسارے ہوئے چندرا اور اس کے پاؤں میں پھولوں کی پازیب
پاؤں میں پھول ! پاؤں میں پھول !! پھول اور پاؤں۔ پاؤں اور پھول
ایک دلفریب نقش۔ ایک بلیغ اور حیاسوز اشارہ۔ ایک معنی خیز نشان
مگر کس اصلیت کا نشان ؟ کس طرف اشارہ ؟ کئی گھنٹوں کی سوچ بچار
کے بعد بھی میرا دماغ اس معمے کو حل نہ کر سکا۔ یہاں تک کہ میں سو گیا
اگلے دن جب اٹھا تو پچھلی رات کے نقوش اتنے مدھم پڑ چکے تھے کہ روز
کے معمول میں چندرا یا اس نامعلوم پھول والے کا خیال بھی نہ کر سکا اور
یوں کئی مہینے گزر گئے۔

کہانی ابھی ختم نہیں ہوئی بلکہ شروع ہوتی ہے۔ چندرا ...
کے فلم میں ناچا جس کا معاوضہ اس کو پانچ سو روپے ...
یہ ناچ صرف اس وقت دیکھا جب فلم تیار ہو گیا۔ ناچ میں ...
بات نہیں تھی۔ مگر بعد میں سنا کہ عوام نے اس کو بہت پسند کیا اور ...
کی وجہ سے چندرا کو کئی فلموں میں کام ملا۔
... نے گھر بار راما کشن کو اپنے ہاں آنے کی دعوت ...

مگر وہ ایک دفعہ بھی نہ گیا۔ جہاں تک میرا تعلق تھا مجھے نہ چندرا سے ملنے کا کوئی موقعہ درپیش آیا اور نہ کبھی مجھے اس کا خیال آیا۔ مگر ایک دن پھر ٹیلیفون کی گھنٹی بجی

"ارے بھائی میں بول رام کشن"

"کہو کیا بات ہے؟"

"شام کو فرصت ہو تو ذرا ادھر ہو جانا۔ تم سے کچھ کام ہے"

خیر صاحب دفتر سے فارغ ہو کر رام کشن کے فلیٹ پر پہنچا۔ وہ اکیلا ہی تھا۔ کہنے لگا۔ "دیکھو بھئی ایک کہانی چاہیئے۔ اپنے اگلے فلم کے لئے"

میں نے کہا "تو پھر دوسرے صاحب سے بات کرو۔ اگر وہ مصروف ہیں تو کمال امروہوی، آغا جانی، دیوان شرر، مدھوک وغیرہ کہانی لکھنے والے موجود ہیں"

اس نے کہا "مگر مجھے تو کوئی نئی چیز چاہیئے وہ تم ہی دے سکتے ہو"

"اگر تمھارا مطلب "نیا" یا "نئی" کے نام سے ہے تو وہ سب ختم ہو گئے ہیں۔ نیا ترانہ۔ نیا زمانہ۔ نئی دنیا۔ نئی زندگی۔ نئی روشنی۔ اب ایک ہی نیا نام رہ گیا ہے۔ نیا پرانا"

"نہیں۔ مجھے نیا یا نئی کا نام نہیں چاہیے۔ نئی قسم کی کہانی چاہیئے یعنی کہانی جس کے قدم زندگی کی اصلیت میں گڑے ہوئے ہوں"

میرا خیال ہے کہ ہر شخص کے دماغ کے کسی کونے میں ایک چھوٹا سا

ہمزاد ... رہتا ہے جو وقت بے وقت کان میں کچھ گھس پُس کر د...
کو "آمد" یا تخلیقی تحریک کہتے ہیں۔ میرا یہ بھی تجربہ ہے کہ یہ ہمزاد ...
ہے جب تک کوئی اقتصادی ضرورت اس کو مجبور کرے کر نہ ا...
یہ واقعہ ہے کہ اس زمانے میں میری مالی حالت خراب تھی۔ مہنگائی ... توڑ رہ
دی تھی۔ دفتر کے ۱۰۰ روپے ماہوار پر کیسے گزارہ ہوتا؟ مگر کہانی
بک جائے تو کئی ہزار مل سکتے ہیں۔ اور یہ بھی واقعہ ہے کہ جب رام کشن ...
ایک نئی قسم کی کہانی لکھنے کو کہا تو میرے ہمزاد نے ایک عورت کی آواز
بنا کر میرے کان میں کہا "ہم پر بھی ایک کہانی لکھ دیجئے نا!"

میں نے فوراً رام کشن سے کہا "تو سنو ایک کہانی۔ پنجاب کے
کسی شہر میں ایک طوائف رہتی تھی۔ اس کے ناچ گانے کا دور دور شہرہ
تھا۔ (دیکھا تم نے ناچ گانے کا انتظام فوراً ہو گیا) ہاں تو اس طوائف
کے ہاں ایک لڑکی پیدا ہوئی جس پر بڑا جشن منایا گیا۔ کیونکہ بیٹی ہی طوائف
کا خزانہ ہوتی ہے جو بڑھاپے میں اس کے کام آتا ہے۔ طوائف نے
اپنی بیٹی کو بڑے ناز و نعم سے پالا۔ ناچ گانا بھی سکھایا اور پڑھنا لکھنا بھی۔ ...
دلی خواہش یہ تھی کہ بڑی ہو کر اس کی بیٹی کو بیسوا نہ کرنا پڑے بلکہ کسی
شریف گھرانے میں اس کی شادی ہو جائے۔ اسی لالچ میں اس نے
ایک سفید پوش آدمی سے خود شادی کر لی جو دراصل چھپا ہوا بدمعاش
تھا اور جو خود طوائف کی بیٹی کو ذریعۂ آمدنی بنانا چاہتا تھا۔ جب بیٹی جوان
ہوئی تو وہ بمبئی آیا۔ بیوی کو مکان لے کر الگ رکھا اور بیٹی کو ... سنا...

ایک کوٹھے پر۔ وہ چاہتا تھا کہ اس سے فلموں میں کام کرائے اور ساتھ میں میشہ بھی۔ اور ساری آمدنی پر خود قبضہ کرے۔ مگر اس عرصے میں لڑکی کو ایک پھول بیچنے والے نوجوان سے اصلی محبت ہو گئی ـــــ"

"اور اس کہانی کا نام ہے چندرما؟" رام کشن نے مسکرا کر

"نہیں۔ چندرا نہیں۔ پاؤں میں پھول۔"

"اچھا آگے کہو۔"

"ہاں تو اس لڑکی کو پھول والے نوجوان سے از حد محبت ہو گئی۔ وہ اپنی زندگی سے متنفر تھی۔ اس نے طے کر لیا کہ وہ شادی کر کے غریبانہ شریفانہ زندگی بسر کرے گی۔ (دیکھا کس طرح گناہ پر پاکبازی غلبہ پاتی ہے) مگر اس کے سوتیلے باپ کو جب اس کا پتہ چلا تو وہ غصّے میں آپے سے باہر ہو گیا۔ اس لڑکی کی خوشامد کی، اس کو دھمکیاں دیں، لالچ دیا کہ وہ ایسا قدم اٹھانے سے باز رہے۔ لیکن لڑکی کی محبت پکّی اور سچی تھی۔ وہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔ اس پر اس کو کمرے میں بند کر دیا گیا۔ لڑکی کی ماں کی مدد سے پھول والے نے اس کو پیغام بھیجا کہ وہ رات اسے بھگا کر لے جائے گا۔ آخری وقت پر سوتیلے باپ کو بھی یہ معلوم ہو گیا۔۔۔۔۔۔"

"پھر کیا ہوا؟" رام کشن نے بے چینی سے پوچھا۔

"ارے! پھر کیا ہوا؟ ۔۔۔۔۔ یہ ابھی نہیں معلوم ۔۔۔۔ کل

بتاؤں گا۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"کہانی خوب ہے، دوست۔ اگر اس کا انجام برصیا چار ہزار دلوائے دیتا ہوں۔"

چار ہزار کا لالچ بھی کتنا زبردست ہوتا ہے! میں ذرا ٹیکسی لے کر دن دھاڑے اس بدنام گلی میں پہنچا۔ کونے پر ایک پھول والے کی دکان تھی۔ میں نے اس سے پوچھا "کیوں میاں۔ یہاں ایک بابو پھول والا ہوا کرتا تھا۔ کہاں ہے اس کی دکان؟" بوڑھے پھول والے نے کہا "جی اس کی دکان یہی تھی جہاں میں بیٹھا ہوں۔ مگر وہ اب بابو پھول والا نہیں رہا مجنوں پھول والا ہوگیا ہے۔" اور یہ کہہ کر اس نے ایک معنی خیز نگاہ اس عمارت پر ڈالی جہاں چندرا رہتی تھی۔ "کہانی کی ایک کڑی تو ٹھیک بیٹھی" یہ کہ میں نے خواہ مخواہ آٹھ آنے کا ایک گلدستہ بنوالیا تاکہ پھول والے سے اور بات چیت کرسکوں۔

"وہ سامنے ہی رہتی ہے سالی۔ چندرا۔ چندرا کہتے ہیں۔" وہ گلدستہ بناتا جارہا تھا اور بولتا جارہا تھا۔ "اچھے خاصے لمڈے پاگل بنادیا۔ ان حرامجادیوں کا کیا ہے۔ آج یہ تو کل وہ۔ مگر وہ کہیں کا نہیں رہا۔ دکان بھی چھوڑ دی۔ جو کچھ جمع جوڑ رکھا تھا سب اس لمڈیا کے پیچھے اڑا دیا..... لو جی گلدستہ بھی تحفہ بنا دیا ہے"

اب کوئی بہانہ بات کرنے کا نہ رہا۔ میں گلدستہ ہاتھ میں چندرا کے مکان پر پہنچا اور سیڑھیاں کا اختتام سلسلہ

چلا۔ دن کو ساری عمارت سنسان تھی۔ میں نے پانچویں منزل پر جا کر دروازہ کھٹکھٹایا تو اسی افسردہ آنکھوں والے بوڑھے سیتا نے دروازہ کھولا۔ اور میں نے دیکھا اس کی آنکھوں میں افسردگی کے ساتھ وحشت اور غم کی بھی جھلک تھی۔"

"چندرا ہے گھر پر ؟"

میں نے سیدھا سا دھا سوال کیا تھا۔ مگر نہ جانے کیوں سیتا پریشان ہو گیا۔ ہونٹوں پر انگلی رکھ کر مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور آواز دبھی کے کہا "چندرا تو باٹلی والا ہسپتال میں ہے۔ بڑی بیمار......." ابھی اتنا ہی کہنے پایا تھا کہ اندر سے "دلال ابا" نکل آیا اور سیتا دم بخود ہو گیا سمجھا کہ آؤ بھگت کی مشین فوراً چالو کر دی جائے گی۔ مگر میں اس کا حلیہ دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ داڑھی بڑھی ہوئی تھی، آنکھوں میں لال ڈورے۔ تہمد پر ایک جیکٹ بنیان۔ اور بجائے روغنی چاپلوسی کے نہایت بدتمیزی سے۔ "او مسٹر کیا ہے ؟ چلتے پھرتے نظر آؤ۔" اور پھر سیتا سے کھسر پھسر کر رہا تھا؟ چل اندر حرامزادے" وہ بیچارہ تو اندر چلا گیا مگر خونیں آنکھیں مجھے گھورتی رہیں۔ تب مجھے اندازہ ہوا کہ وہ نشے میں تھا۔

"پولیس! تم پولیس کے آدمی ہو۔ مگر یہ مت بھولو کہ میں کون ہوں۔ پولیس کمشنر صاحب کا دوست ہوں۔ دوست"

"پولیس ؟" میں نے حیرت سے کہا "تم کیا بک رہے ہو ؟"

"ہاں۔ ہاں۔ تم میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ میری چندرا نے پولیس کلب

میں ڈانس کیا تھا۔ خود گورنر صاحب نے اس کے گلے میں ہار ڈالا تھا
اور یہ کہہ کر اس نے دھاڑ سے دروازہ بند کر دیا۔

میں اس کا مطلب کچھ نہ سمجھا مگر اسی شام کو ملاقاتیوں کے اوقات پر باٹلی والا ہسپتال پہنچا۔ بڑی مشکل سے چندرا کا پتہ ملا۔ جب میں اس کے پلنگ کے قریب گیا تو دیکھا کہ وہ سر سے پیر تک چادر اوڑھے ہوئے لیٹی ہے صرف چہرہ کھلا ہوا تھا مگر اس پر اتنی زردی چھائی ہوئی تھی کہ چند لمحوں کے لئے تو میں سمجھا کہ وہ مر گئی ہے۔ مگر میری آہٹ پا کر اس نے آنکھیں کھولیں میں کرسی نزدیک سرکا کر بیٹھ گیا۔ اور گلدستہ اس کے تکئے پر رکھ دیا۔ چندرا نے میری طرف کروٹ لی تو اس کا چہرہ گلدستے کے مقابل آ گیا۔ خوشبو نے اس کے حواس کو بیدار کر دیا۔ اس کے منہ سے بس ایک لفظ نکلا "پھول!" اور اس کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے۔ کمزوری اور بیماری اور آنسوؤں نے اس کے چہرے پر سے گناہ اور ریاکاری کے سب نشانوں کو دھو دیا تھا۔

"آپ؟ یہاں کیسے؟" اس نے کمزور آواز میں پوچھا۔

یہ تو میں نہیں کہہ سکتا تھا کہ چار ہزار روپے میں اس کی کہانی بیچنے کے لئے میں انجام کی تلاش میں یہاں آیا تھا۔ میں نے کہا کہ میں اس سے ملنے اس کے گھر گیا تھا وہاں معلوم ہوا کہ وہ بیمار ہے اس لئے میں نے یہاں آنا اپنا اخلاقی فرض سمجھا۔

"آپ بہت اچھے ہیں" اس نے کہا۔ اور پھر ہنس دی۔

"آپ کہانی لکھتے ہیں نا ؟"

کچھ جواب دینے والا ہی تھا کہ میں نے سفید چادر پر ایک سایہ پڑتے ہوئے دیکھا۔ پیچھے مڑا تو بابو کو کھڑا پایا۔ شکل سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ کئی راتوں سے سویا نہیں ہے اور شاید روتا بھی رہا ہے۔ اس کے ہاتھ میں پھولوں کی ایک "بینی" تھی۔ میرے لالچی دماغ نے کہا "کہانی پوری ہوا چاہتی ہے چار ہزار روپے مبارک۔"

بابو نے نہ جانے مجھے دیکھا یا نہیں۔ وہ چندرا کے سرہانے جاکر کھڑا ہوگیا اور الفاظ کا ایک دھارا بہہ پڑا۔ "مجھے ابھی ابھی معلوم ہوا چندرا کہ تم یہاں ہو۔ انہوں نے مجھ سے بڑے بڑے جھوٹ بولے۔ یہ بھی کہا کہ تم ایک سیٹھ کے ساتھ چلی گئی ہو۔ مگر میں نے ان کی کسی بات کا اعتبار نہیں کیا۔ مگر یہ تمہارا کیا حال ہوگیا ہے، چندرا ؟ تم غم کی وجہ سے بیمار ہوگئی ہو۔ مگر اب تم کوئی غم نہ کرو۔ میں نے کھولی کرائے پر لے لی ہے۔ آج ہی تمہیں اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔"

بابو کہے جا رہا تھا اور میں ٹکٹکی باندھے چندرا کے چہرے کو دیکھ رہا تھا جہاں مختلف جذبات ایک دوسرے سے آنکھ مچولی کھیل رہے تھے۔ میں نے پہلے دیکھا کہ بابو کی آمد سے اس کے چہرے پر رونق، اس کی آنکھوں میں زندگی کی چمک آگئی ہے۔ مگر پھر نہ جانے کیوں دفعتاً یہ چمک اس طرح غائب ہوگئی، جیسے بٹن دبانے سے بجلی کی روشنی گل ہوجائے۔ اس کی جگہ مایوسی نے لے لی۔ پھر ان آنکھوں میں ایک نئے اور ......

خوفناک ارادے کی لہر آئی .... اور پھر ....

میں نہ صرف عورت پرست نہیں ہوں بلکہ عام طور سے ان کی پاکبازی محبّت اور قربانی کے دعوؤں کو ایک ڈھونگ سمجھتا ہوں جس کو وہ مردوں کو اپنے جال میں پھنسانے کے لئے رچاتی ہیں۔ مگر میں کبھی خواب میں بھی یہ نہ سوچ سکتا تھا کہ ایک عورت اتنی طوطا چشم، اتنی سنگدل، اتنی گری ہوئی ہوسکتی ہے جتنی چندرا اس لمحے میں نکلی۔ جب اس نے بجائے بابو کا جواب دینے کے میری طرف مڑکر کہا "ڈارلنگ۔ اس آدمی سے کہو یہ جائے یہاں سے۔"

ڈارلنگ! اور مجھے؟ — جس کی شکل اس نے زندگی میں صرف دو بار دیکھی تھی۔ اور یہ شخص یہاں سے چلا جائے جس نے اپنی محبت، اپنی زندگی، اپنا سب کچھ اس کے قدموں میں رکھ دیا تھا۔ اور کیوں؟ اس کی ایک ہی وجہ ہوسکتی تھی کہ بابو ایک غریب پھول والا تھا۔ اور میں نسبتاً ایک کھاتے پیتے اور سفید پوش طبقے کا — اُف وہ رے عورت! کیا تو اسی برتنے پر عشق و محبت کے راگ الاپتی ہے؟

بابو چند لمحے تک اس طرح ساکت کھڑا رہا جیسے اس کو سانپ سونگھ گیا ہو اس کے ہاتھ میں اب بھی پھولوں کی وہ "بینی" تھی جو وہ چندرا کے لئے لایا تھا۔ اس نے ڈرتے ڈرتے اس کو پلنگ کی پائنتی رکھ دیا —

"میں .... میں .... یہ لایا تھا .... تمہارے لئے"

چندرا نے اپنا رخسار میرے لائے ہوئے پھولوں سے لگاتے

ہوئے کہا " اس کی ضرورت نہیں ۔ دیکھو یہ کتنے خوبصورت پھول لائے ہیں "
" تو پھر پاؤں ہی میں باندھ لینا " یہ کہہ کر وہ چلا گیا اور مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے چھن سے اس کی امید اور محبت کا تار ہمیشہ کے لئے ٹوٹ گیا ہو۔

میں نے چندرا کی طرف دیکھا اور سوچا " اس ذلیل عورت پر غصہ کرنا بے کار ہے۔ یہ سوائے نفرت ...... عمیق ، بے پناہ نفرت کے اور کسی چیز کے قابل نہیں ہے "
وہ بولی " میں نے آپ کے ساتھ گستاخی کی اس کی معافی چاہتی ہوں "

میں نے " بینی " کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا " معافی ان پھولوں سے مانگو۔ بات یہ ہے چندرا کہ تم ان بدنصیب عورتوں میں سے ہو جو نہ پھولوں کی قدر جانتی ہیں اور نہ محبت کی ۔ اس رات کو جب بابو نے تمھارے پاؤں میں پھولوں کا گجرا ڈال دیا تھا تم اس کو مذاق سمجھ کر کھلکھلا کر ہنس پڑی تھیں۔ مگر میں سوچتا رہا تھا کہ سر کے پھولوں کی یہ تحقیر کہ وہ پاؤں ڈالے جائیں ۔ آخر کیوں ؟ بابو نے تمھارے پاؤں میں پھول نہیں ڈالے تھے بلکہ اپنا دل تمھارے قدموں میں رکھ دیا تھا ۔ تمھیں چاہئے تھا کہ ان پھولوں کو پاؤں سے نکال کر اپنے سر میں لگا لیتیں مگر نہیں تمھیں تو پھولوں اور دلوں دونوں کو پیروں سے مسلنے میں مزا آتا ہے ۔ آج میری سمجھ میں آیا ہے کہ پاؤں میں پھول کس اصلیت کا نشان ہے ؟ یہ تمھارے ،

جیسی عورتوں کی سنگدلی اور آوارگی کا نشان ہے۔ تم پھولوں کو پاؤں میں پہننے ہو اور پھولوں کی طرح پاک اور پوتر جذبات کو قدموں میں روندتے ہو۔ تو تو ...." مجھ پر جنون سا سوار ہوگیا۔ "تو تو ان پھولوں کو پہنو اپنے پاؤں میں۔ یہ پھول نہیں ہے چندرا یہ بابو کا دل ہے" میں نے ایک ہاتھ سے بنی کو اٹھایا اور دوسرے ہاتھ سے پائنتی سے چادر الٹتے ہوئے کہا "وہ کہہ گیا ہے کہ پاؤں ہی میں باندھ لینا۔ میں اس کا کہنا........"

فقرہ نامکمل رہ گیا۔ بنی میرے ہاتھ سے گر گئی اس جگہ جہاں چندرا کے پاؤں ہونے چاہیئے تھے۔ مگر وہاں پاؤں نہ تھے۔ وہاں کچھ نہ تھا صرف دو ٹانگوں کے ٹھنڈ پٹیوں میں بندھے ہوئے۔

"چندرا!" اور دفعتاً میرے دماغ میں چند تصویریں مجنونانہ طریقے سے چکر کھانے لگیں۔ "لال ابا" کی خونیں آنکھیں۔ ایک دھاردار تلوار۔ اور سیتا کا افسردہ چہرہ۔ اور پھر وہ خونیں آنکھیں۔

"چندرا!"

"تلوار کی دھار پر ناچنا آسان نہیں ہے۔ بڑا خطرناک ہوتا ہے۔ ابھی انہوں نے ڈاکٹر سے کہا۔"

"چندرا!"

"آپ اتنے پریشان کیوں ہیں۔ آپ ہی نے تو کہا تھا کہ اگر کوئی چلتی مشین میں پاؤں ڈالے گا تو اس کا پاؤں ضرور کٹ جائے گا۔"

چڑھاؤ اتار

چڑھائی کتنی خوشگوار تھی!

جوں جوں سڑک بلندی کی طرف جا رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ دنیا کی تمام کثافت، گندگی، گرد و غبار، آرام و مصائب دور —— بہت دور —— رہ گئے ہیں۔ ہوا میں ہلکی ہلکی خنکی تھی اور ایک عجیب خوشبو۔ چیڑ کے درختوں، پھولوں، گھاس اور گیلی مٹی کی ملی جلی خوشبو۔ سرسبز پہاڑیاں گل پوش تھیں۔ اور عطر بیز۔ فضا میں عجیب سا کیف تھا۔ جیسے بے پئے نشہ چڑھتا چلا جا رہا ہو۔ مگر ایسا نشہ جس کی مدہوشی بھی ہوش آور ہو۔

جس سے دماغ سونے کے بجائے جاگ اٹھے۔ اور دل کے تار زندگی کی مضراب سے چھو کر جھن جھنا اٹھیں۔

لاری کھانستی، کھنکارتی، شور مچاتی، ایک بے سُرا گیت گاتی بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ گیئرز کی تبدیلی کی گڑگڑاہٹ کے ساتھ موڑ پر پہاڑی کے دامن سے پہلو بچاتی اوپر چڑھی تو شمالی پنجاب کا تمام نقشہ نرمل کی نظر کے سامنے پھیلا جاتا تھا۔ اس نے فتحمندی کے احساس کے ساتھ میدان پر نگاہ دوڑائی۔ راولپنڈی کا شہر ایسا نظر آیا جیسے گڑیوں کے گھروندوں کی بستی ہو۔ وہ تھا ریلوے سٹیشن جہاں وہ دو گھنٹے پہلے صبح سویرے لاہور کی بس سے اترا تھا۔ اور وہ تھی بچوں کے کھلونے والی ریل گاڑی کی سیدھی سی لائن جو لاہور کی سمت کو افق پر پہنچ کر غائب ہو گئی تھی۔

لاہور۔ مال روڈ۔ سرکلر روڈ۔ بھاٹی دروازہ۔ تانگے۔ تانگے والے "بھاٹی دروازے اک اک آنے" لارنس گارڈن۔ سفید شلواریں۔ رنگین دوپٹے۔ "میرا حصہ دور کا جلوہ"

لاہور۔ ریلوے کلیرنگ آفس۔ مکھیوں کا ایک چھتہ۔ بھن بھن۔ بھن بھن۔ ہر کلرک ایک مکھی تھا۔ وہ خود ———— نرمل کمار جو قدرت کی طرف سے ایک شاعرانہ طبیعت اور ذوقِ حسن لے کر آیا تھا ———— ایک کلرک تھا ایک مکھی تھا! بھن بھن۔ صبح کے دس بجے اور سینکڑوں مکھیاں بھن بھن کرتی چھتے میں داخل ہو جائیں اور پھر چھ بجے شام کو باہر نکلیں۔ نہیں ایک کلرک مکھی سے بھی بدتر تھا۔ مکھی کے چھتے پر کوئی حملہ کرے تو مکھی اس کو کاٹ سکتی ہے

گویندک کو ہیڈ کلرک اگر گالی دے تو وہ اس کو کاٹ نہیں سکتا۔ مکھی اور مکھی برابر ہوتی ہے۔ مگر کلرک کے اوپر ہیڈ کلرک۔ ہیڈ کلرک کے اوپر سپرنٹنڈنٹ۔ سپرنٹنڈنٹ کے اوپر ٹرانک منیجر۔ اس کے اوپر جنرل منیجر۔ ان سب کے اوپر ریلوے بورڈ۔ ریلوے ممبر۔ ایک اینٹ پر دوسری اینٹ انسانوں کا قطب مینار۔ اور ساتوں منزل کا بوجھ کلرک کے کاندھوں پر۔ خیال ہی سے نرمل کے کاندھوں میں درد سا محسوس ہونے لگا۔

لاہور! ہر پہلی تاریخ کو ساٹھ روپے۔ بس۔ وہ ہر دفعہ سوچتا۔ امید کرتا۔ اور دعا مانگتا کہ اکاؤنٹنٹ کی غلطی سے اس کے لفافے میں پانچ دس روپے زائد نکل آئیں۔ مگر وہی ساٹھ روپے نکلتے۔ کبھی پانچ پانچ روپے کے بارہ نوٹ۔ کبھی کبھی دس دس روپے کے چھ نوٹ اور پھر دوسری تاریخ کو ان میں سے دس روپے گھر کے کرائے میں چلے جاتے اور پچاس روپے وہ گھر چلانے کے لئے اپنی بیوی کو دے دیتا۔

اس کی بیوی! اسے کتنی نفرت تھی اس سے! گوبندی۔ گوبندی! کتنا غیر شاعرانہ نام تھا۔ اتنی ہی غیر شاعرانہ وہ خود تھی۔ اس کی اکلوتی جھلک ہی ان بھرے خوابوں کو ہمیشہ کے لئے ختم کرنے کو کافی تھی زرد زرد چہرہ۔ چھوٹی چھوٹی آنکھیں۔ سیدھے، تیل سے چپڑے ہوئے بال۔ نہ کپڑے پہننے کا سلیقہ، نہ بات کرنے کا ڈھب۔ میلی شلوار، ڈھیلی ڈھالی قمیص۔ ملگجی سی اوڑھنی۔ جو مل گیا پہن لیا۔ روٹی بیت اس کو چھو بھی نہ گئی تھی۔ دن بھر چولھے یا ہانڈی میں لگی رہتی۔ دفتر سے آ کر نرمل آواز دیتا

"گوبندی" تو اس ہیئت کذائی میں آکر کھڑی ہوتی کہ ہاتھ آٹے میں سنے ہوئے منہ پر راکھ کا غازہ، گالوں پر چولہے کی کالونچ۔ اور ایک نفرت انگیز انکسار کے ساتھ "جی!" کہہ کر اس کے جوتے کے تسمے کھولنے لگتی۔ نرمل کے تمام رومانی تصورات اور شاعرانہ تخیلات ایک لمحے میں چکنا چور ہو جاتے۔ وہ کہتا "کیوں، گوبندی، سینما چلنا ہے؟" جواب ملتا ہے "جی، میں کیا کروں گی آپ چلے جائیے۔ مجھے تو ابھی روٹی پکانی ہے" روٹی پکانی ہے! گویا انسان بس روٹی کھانے پکانے کے لئے ہی زندہ رہتا ہے۔ سینما۔ ناچ۔ گانا۔ سیر تفریح۔ کسی چیز کا بھی تو شوق نہیں تھا کم بخت کو! کبھی نرمل کے مجبور کرنے پر اس کے ساتھ باہر چلی بھی جاتی تو الٹے سیدھے سوالوں سے ناک میں دم کر دیتی: "کیوں جی، یہ موٹر کتنے کی ہوگی؟ کیوں جی، بجلی کے ہنڈوں میں تیل کون ڈالتا ہے؟ کیوں جی، یہ اندر بالا اور کنن بالا دونوں بہنیں ہیں کیا؟" "کیوں جی! کیوں جی! اس کا جی جل جاتا کہ اب سے کبھی اپنے ساتھ سیر کو نہ لے جائے گا۔

نہ جانے کس طرح اس نے گوبندی کے ساتھ یہ تین سال گزارے تھے۔ جہاں اس کے ماں باپ نے اس پر اور بہت سی "عنایات" کی تھیں وہاں گوبندی جیسی بیوی اس کے پتے باندھ دی تھی۔ اس کی زندگی تباہ کرنے کے لئے انہوں نے کیا کچھ جتن نہیں کئے تھے۔ سب سے پہلے تو اس کو مادھو سنگھ جیسا نام دیا تھا۔ مادھو سنگھ! کیا بھونڈا گنوارو نام تھا! بھلا اس نام کا کوئی شاعر، افسانہ نگار یا آرٹسٹ

ہوا ہے !" "محبت کی شفق" از جناب مادھو سنگھ صاحب ! "نغمۂ شباب" از جناب مادھو سنگھ صاحب مادھو ! "شعلۂ انقلاب" از مادھو ! مادھو ! بیس سال تک اس نام نے اس کی زندگی کو تلخ بنائے رکھا تھا۔ اس نام کو لے کر بھلا وہ کس منہ سے محفل ادب میں جا سکتا تھا۔ اس لئے لاہور آکر اس نے پہلا کام یہ کیا تھا کہ اس "مادھو سنگھ" نام کو راوی کی نہر میں ڈبو دیا تھا۔ اب وہ نرمل کمار تھا۔ نام ہی سے شاعری اور رومانیت ٹپکتی تھی "آپ کا اسم شریف؟" "خاکسار کو نرمل کمار کہتے ہیں !" "او وہی نرمل کمار جن کا افسانہ 'روح ادب' کے سالنامے میں شائع ہوا ہے ! بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر" کتنا فرق تھا نرمل کمار اور مادھو سنگھ میں ! اگر وہ اپنے گاؤں جلال پور جٹاں جاتا تو اس کے ماں باپ اب بھی اس کو مادھو مادھو کہہ کر پکارتے۔ اسی لئے وہ وہاں جانا پسند نہیں کرتا تھا۔ سال بھر میں ایک آدھ بار جاتا اور دو چار روز ہی میں کوئی بہانہ کر کے واپس آ جاتا۔

لاری ہانپتی کانپتی ایک اور موڑ پر چڑھی تو پھر میدان نظر آیا۔ مگر اب وہ اتنے اونچے چڑھ آئے تھے کہ نہ راولپنڈی نظر آتا تھا نہ ریلوے لائن۔ راولپنڈی۔ لاہور۔ ریلوے کلیرنگ آفس۔ گوبندی۔ جلال پور جٹاں۔ مادھو، مادھو پکارنے والے ماں باپ۔ یہ سب اب بہت دور، بہت نیچے رہ گئے تھے۔ اور وہ ایک آزاد پرندے کی طرح فضا میں اونچا اڑتا چلا جا رہا تھا۔ اونچا بہت اونچا۔

نرمل کمار نے دو سو روپے میں اپنے افسانوں کا مجموعہ ایک پبلشر کو

دیا تھا۔ سو روپے ریڈیو کی تقریروں سے کمائے تھے۔ ان تین سو روپے کے سہارے وہ گوبندی کو جلال پور جٹاں بھیج کر ریلوے کلیرنگ آفس سے ایک مہینے کی چھٹی لے کر اب کشمیر جا رہا تھا۔ کشمیر جنت نظیر وہ ایک مہینے کے لئے بھول جانا چاہتا تھا کہ اس کی پیدائش جلال پور جٹاں جیسی غیر شاعرانہ جگہ میں ہوئی ہے، اس کا باپ ان پڑھ زمیندار ہے، اس کی بیوی چھوٹی چھوٹی آنکھوں والی گوبندی ہے، اور وہ ریلوے کلیرنگ آفس کا ایک کلرک ہے جو ہر روز ہیڈ کلرک کی جھڑکیاں اور سپرنٹنڈنٹ کی گالیاں کھانے پر مجبور ہے لاہور سے راولپنڈی تک وہ سکنڈ کلاس میں آیا تھا۔ راولپنڈی سے اس نے "سو پرس" میں اگلی سیٹ لی تھی تاکہ اس سفر سے وہ پوری طرح لطف اندوز ہو سکے۔ ماضی کے تلخ ایام پس پشت پڑے تھے۔ اس کا رخ رومانی، دلچسپ روح پرور مستقبل کی طرف تھا۔ وہ پستی سے بلندی کی طرف جا رہا تھا۔

برابر کی سیٹ پر ایک لڑکی بیٹھی ہوئی تھی۔ لڑکی! اس کو صرف لڑکی کہنا اس کے ساتھ سراسر ناانصافی تھی۔ لڑکی تو گوبندی بھی تھی۔ مگر کتنا فرق تھا گوبندی میں اور اس لڑکی میں۔ زمین آسمان کا فرق۔ جہنم اور جنت کا فرق۔ اس لڑکی کی قربت کتنی روح پرور تھی۔ اس کے ریشمی لباس سے ایک عجیب خوشبو آ رہی تھی۔ یہ تیز عطر نہیں تھا جس کی خوشبو کا طمانچہ لگتا ہے۔ یہ ولایتی سینٹ کی دھیمی دھیمی، دبی دبی خوشبو تھی جو دھیرے دھیرے انسان کے نتھنوں میں سے ہوتی ہوئی اس کے دل کی تہہ میں اترتی ہے سینٹ کے ساتھ ایک اور خوشبو بھی ملی ہوئی تھی۔ وہ خوشبو جو ایک جوان

صحت مند عورت کے جسم سے، اس کے بالوں سے، اس کے روئیں روئیں سے نکلتی ہے۔ بظاہر نرمل کھڑکی کے باہر پہاڑی نظارہ دیکھ رہا تھا۔ مگر اس کے دل و دماغ کی توجہ برابر والی نشست پر مرکوز تھی۔ کاش اس لڑکی سے کسی طرح اس کی ملاقات ہو جائے!۔

مڑ کر دیکھنا خلاف تہذیب تھا۔ مگر ایک بار نرمل نے سامنے نظر کی تو ڈرائیور کے مقابل لگے ہوئے آئینے میں اس کو اپنی ہم سفر کا چہرہ نظر آیا۔ اُف کتنا شاداب چہرہ تھا وہ۔ میدہ اور شہاب کی ملاوٹ والی رنگت۔ گوری گوری۔ گلابی گلابی۔ چہرے پر ہلکا سا غازے کا غبار۔ ستوان ناک۔ نشیلی آنکھیں جو کبھی تاروں کی طرح چمکنے لگتی تھیں، کبھی لانبی لانبی پلکوں کے پردے میں چھپ جاتی تھیں۔ کمان دار ابرو۔ شفاف پیشانی۔ سر پر ایک پھولوں والا ریشمی رومال بندھا ہوا تھا۔ پھر بھی بالوں کی چند باغی لٹیں چہرے پر بل کھا رہی تھیں۔ مگر جس چیز نے نرمل کو بالکل دیوانہ بنا دیا وہ تھے اس کے ہونٹ جو لپ اسٹک کی لالی سے گلنار تھے۔ کتنی مٹھاس تھی ان ہونٹوں میں۔ کتنا رس۔ کتنا گداز۔ نرمل کے شاعرانہ دماغ نے ان کیلئے کتنی ہی تشبیہیں سوچیں مگر کوئی بھی تسلی بخش ثابت نہ ہوئی۔ وہ دبی ہوئی آواز میں گنگنانے لگا۔

آہ وہ دوشیزہ لب، گلریز لب، گلنار لب
آہ وہ ابِ آشنا لب، شوخ لب، خونبار لب

چہرے پر نقاب بن کے چھا گیا۔ کتنا کیف آور لمس تھا اس پلّو کا۔ کتنی غنودہ سی خوشبو تھی اس میں۔ ہلکی ہلکی۔ دبی دبی۔ نرمل کا جی چاہا کہ بس یہ پلّو اسی طرح اس کے چہرے پر پڑا رہے۔ مگر چوڑیوں کی ہلکی سی کھنکھناہٹ کے ساتھ ایک گوری کلائی میں جنبش پیدا ہوئی اور پلّو کھینچ لیا گیا۔

لاری مری کے قریب پہنچ گئی تھی "سنی بنک" کا موڑ آیا تو دوسری طرف سے ایک موٹر بغیر ہارن دیئے آ گئی۔ ڈرائیور نے ہوشیاری سے سٹیرنگ ویل بائیں طرف موڑ کر بچا لیا۔ مگر دفعتاً اس جھٹکے سے لاری کے سب مسافر بوتل میں جامنوں کی طرح خلط ملط ہو گئے۔ نرمل خود بائیں جانب کی کھڑکی سے ٹکرایا، لوہے کا فریم اس کے بازو میں چبھ گیا، مگر اسی وقت اس کے دائیں پہلو پر ایک نرم گداز و ریشمی بوجھ آ پڑا۔ نرمل کے تمام بدن میں ایک جھرجھری سی آ گئی۔ ایک لمحے میں لاری پھر سیدھی ہو گئی۔ اور سب مسافر سنبھل کر بیٹھ گئے۔

"Sorry" لڑکی نے سنبھلتے ہوئے کہا۔

"کوئی بات نہیں" نرمل نے موقع کو غنیمت پا کر گفتگو کا سلسلہ چھیڑا۔

"وہ موٹر والا بڑا ہی نالائق تھا۔"

لڑکی خاموش تھی۔ اب کیا بات کی جائے؟ کچھ سوچ کر نرمل نے کہا "اگر آپ اس کھڑکی میں سے باہر کی سیر کرنا چاہیں تو آپ ادھر آ جائیے میں آپ کی جگہ لے لوں گا۔"

"تھینک یو۔"

چلتی گاڑی میں اتنے تنگ مقام پر نشستیں تبدیل کی جائیں تو دو جسموں کا

گھرانا بلکہ رکھ رکھاؤ قدرتی ہے۔ لاری کا سفر نرمل کے لئے ایک ناقابلِ فراموش
رومانی حادثہ بنتا جارہا تھا۔

"کیا آپ کشمیر جارہی ہیں؟"

"جی ہاں۔"

"اکیلی ہی؟"

"جی ہاں۔ اور آپ؟"

"میں بھی کشمیر جارہا ہوں۔ کتنا عرصہ قیام رہے گا آپ کا؟"

"کوئی ایک مہینہ۔"

"عجیب اتفاق ہے۔ میں بھی ایک ہی مہینے کے لئے جارہا ہوں۔"

گفتگو کا سلسلہ شروع ہوگیا تو ایک بات سے دوسری بات نکلتی چلی گئی۔ لڑکی کا نام شیریں تھا۔ شیریں! کتنا میٹھا نام! کتنا پیارا نام! وہ بمبئی کی رہنے والی تھی۔ کالج میں پڑھتی تھی۔ ایک آزاد ماحول سے آئی تھی۔ اس لئے اس میں شمالی ہندوستان کی لڑکیوں کی سی غیر ضروری شرم اور جھجک نہیں تھی۔ وہ مردوں سے اُن کی برابری کی سطح پر بات کرسکتی تھی۔ لٹریچر، سیاست، آرٹ، فلم، نرمل نے جو موضوع بھی چھیڑا شیریں کو اس میں طاق پایا۔ یہ تھا نمونہ اُس نئی دنیا کی نئی عورت کا جو نرمل کا آئیڈیل تھی۔ اور ایک گوبندی تھی کہ وہ سوائے روٹی پکانے کے اور کسی بھی موضوع پر گفتگو نہ کرسکتی تھی! کتنا فرق تھا گوبندی اور شیریں میں! آسمان و زمین کا فرق۔ جہنم و جنت کا فرق۔

لاری بانیہال کی نیچی چڑھائی پر چلی جارہی تھی۔ دفعتاً انجن میں گڑگڑاہٹ

ہوئی اور گاڑی جھرجھری سے کر ٹھہر گئی۔ ڈرائیور نے اتر کر انجن کھولا اور مسافروں سے کہا۔ آپ کچھ دیر آرام کر لیں۔ انجن ٹھیک ہونے میں دیر لگے گی۔ کئی گھنٹوں سے بیٹھے بیٹھے بدن اکڑ گئے تھے۔ موقعہ غنیمت جان کر سب مسافر اتر پڑے۔ پنجابی سوداگر۔ دہلی کے رئیس پانوں کی ڈبیہ بٹوہ سنبھالے ہوئے۔ دو نوجوان جو کالج کے طالب علم معلوم ہوتے تھے اور شیریں کی طرف گھور گھور کر دیکھ رہے تھے۔ (نہ جانے کیوں نرمل کو اُن کی یہ حرکت نہایت نامعقول معلوم ہوئی) تین غریب کشمیری جنھوں نے میلے دھسّے اوڑھ رکھے تھے۔ ایک برقعہ پوش عورت اور اس کا خاوند مگر اس وقت نرمل کو صرف ایک ہم سفر میں دلچسپی تھی۔

انجن کو ٹھیک کرنے میں پورے اڑھائی گھنٹے لگ گئے۔ مگر نرمل اور شیریں دونوں کو ڈرائیور کی سستی سے کوئی شکایت نہ ہوئی۔ اس عرصے میں وہ دونوں ٹہلتے ہوئے دور سڑک پر نکل گئے۔ پہاڑی پر پگڈنڈی کے راستے چڑھے شیریں اونچی ایڑی کا جوتا پہنے ہوئے تھی۔ جب وہ کنکریوں پر پھسلنے لگی تو نرمل کو اس کا ہاتھ پکڑ کر سہارا دینا پڑا۔ کتنا نرم اور نازک ہاتھ تھا اس کا! پتلی پتلی گوری گوری انگلیاں جن کے ناخن کیوٹکس کی بدولت یاقوت کی طرح سرخ ہو رہے تھے! جب وہ تھک گئے تو پہاڑی کی ڈھلان پر گھاس پر پاؤں پھیلا کر بیٹھ گئے۔ خود رو پھول اُگے ہوئے تھے۔ نرمل نے چھوٹے چھوٹے پھولوں کا ایک گچھا شیریں کو دیا جو اس نے اپنے بالوں میں لگا لیا۔ بھوک لگی تو پہاڑی بچوں سے سیب اور ناشپاتیاں خرید کر کھائیں۔ پھر قریب کے ایک چشمے پر جا کر پانی پیا۔ منہ دھویا۔ کتنا ٹھنڈا اور میٹھا پانی تھا! اور شیریں کے سیاہ گھنگھریالے بالوں پر

پانی کی بوندیں کتنی اچھی معلوم ہو رہی تھیں! مُنہ دھو کر شیریں نے اپنا چہرہ اور ہاتھ نرمل کے سفید رومال سے خشک کئے اور پھر اپنے بیگ میں سے پاوڈر پف اور لپ اسٹک نکال کر اپنے چہرے کا حسن دوبالا کرنے لگی۔

"شکریہ۔ لیجئے اپنا رومال۔ آئیے اب واپس چلیں۔"

جیب میں رومال رکھنے سے پہلے نرمل نے شیریں کی نظر بچا کر اس کو سونگھا تو سینٹ اور شیریں کی ملی جلی خوشبو سے معطّر پایا۔ تین آنے کا سفید چیتھڑا چند لمحوں میں ایک بیش قیمت یادگار بن گیا تھا۔

سورج زوال پر تھا۔ ہواؤں کافی خنکی پیدا ہو چلی تھی۔ لاری چلنے سے پہلے شیریں نے اپنا کوٹ پہن لیا۔ قیمتی، ملائم کپڑا۔ نئی وضع کی تراش۔ کالر پر بیش بہا سمور لگا ہوا۔ نرمل نے اپنا اوورکوٹ باہر رکھ چھوڑا تھا۔ مگر شیریں کے سامنے اس پرانے، رفو کئے ہوئے، غرغل نما اوورکوٹ کو پہنتے اسے کو شرم محسوس ہوئی۔

"آپ بھی اپنا کوٹ پہن لیجئے نا، مسٹر نرمل" شیریں نے کہا "سردی بڑھتی جا رہی ہے۔"

اب تو کوئی چارہ ہی نہ تھا۔ لاری چل پڑی۔ سورج بادلوں میں چھپ گیا تھا۔ ہوا خنک سے برفیلی ہو گئی۔ شیریں نے اپنے کوٹ کے سموری کالر کو الٹ لیا۔ نرمل نے جیبوں میں ہاتھ ڈال لئے۔ دائیں جیب میں ہاتھ ڈالا تو کپڑے کی ایک چھوٹی سی تھیلی ملی۔ اور اس تھیلی کو ہاتھ لگاتے ہی اس کو گوبندی کی یاد آ گئی۔

"اس تھیلی میں میں نے سپاری، الائچی، سونف، اور لونگیں رکھ دی ہیں سنا ہے موٹر جب پہاڑ پر چڑھتی ہے تو چکر آنے لگتے ہیں۔ متلی بھی ہوتی ہے..."
"نہیں نہیں۔ مجھے یہ واہیات چیزیں نہیں چاہئیں۔ مجھے کیا دودھ پیتا بچّہ سمجھا ہے؛"
"پھر بھی لے جائیے نا۔ آپ کے نہیں تو شائد کسی اور ہی کے کام آ جائے۔"
"میں نے کہہ دیا مجھے نہیں چاہئے۔ نہیں چاہئے۔ نہیں چاہئے۔" جب گوبندی اس قسم کی جاہلانہ فرض شناسی کا اظہار کرتی تھی تو نرمل کو بھی ضد ہو جاتی تھی۔

اس نے تھیلی کو اٹھا کر پرے پھینک دیا تھا۔ مگر معلوم ہوتا تھا کہ گوبندی نے آنکھ بچا کر اسے پھر کوٹ کی جیب میں ڈال دیا تھا۔ "کیسی جاہل، کندہ ناتراش عورت سے واسطہ پڑا ہے۔" نرمل نے سوچا اور اس کا جی چاہا کہ اس تھیلی کو جو گوبندی کی طرح گنوار اور دقیانوسی تھی اٹھا کر کھڑکی سے باہر پھینک دے مگر وہ بیچ میں بیٹھا تھا۔ ایک طرف ڈرائیور تھا اور دوسری طرف شیریں۔ انہوں نے دیکھ لیا تو پھر خواہ مخواہ سوالوں کے جواب دینے پڑیں گے۔ پھر بھی اس نے جیب سے ہاتھ نکال لیا۔ تھیلی کو چھو کر اس کو گوبندی کا خیال آتا تھا۔ اور گوبندی کا خیال آتے ہی غصّہ۔

لاری پھرتی سے چڑھائی پر چڑھ رہی تھی۔ سامنے پہاڑوں کی چوٹیوں پر بادل تیر رہے تھے۔ فضا میں ایک عجیب حسن، ایک عجیب سکون تھا لاری کی گھر گھراہٹ بھی لاہوتی موسیقی معلوم ہوتی تھی۔ دور نیچے گھاٹی میں دریا

کا پانی نیلگوں تھا۔ اوپر پہاڑی کی سرسبز ڈھلان پر بھیڑیں چر رہی تھیں۔ کہیں دور کوئی چرواہا بانسری بجا رہا تھا۔ ایک درد بھرا راگ۔ مگر یہ میٹھا میٹھا درد تھا۔ میٹھا میٹھا راگ۔ پُرسوز۔ پُرسکون۔ اور کچھ ایسا ہی راگ ان آبشاروں میں تھا جن کے قریب سے لاری گزر رہی تھی۔ اور جن کی پھوار اڑ کر شیریں کے چمکیلے بالوں میں موتی پرو رہی تھی۔

بریک کے جھٹکے کے ساتھ لاری ٹھہر گئی۔ یہ ڈومیل کا ڈاک بنگلہ تھا۔ ڈرائیور نے کہا "آج کی رات یہیں رہنا ہوگا۔"

نرمل اور شیریں نیچے اتر کر ڈاک بنگلے میں چلے گئے۔ خانساماں سے کہہ کر اپنا سامان لاری سے اتروایا اور چائے کا آرڈر دیا۔ ڈاک بنگلہ خالی تھا اس لئے ان دونوں کو ایک ایک کمرہ آسانی سے مل گیا۔ گرم پانی سے منہ ہاتھ دھو کر نرمل باہر نکلا تو دیکھا کہ شیریں نے اس عرصے میں لباس بھی تبدیل کر لیا ہے۔ ساڑھی اور بلاؤس کے بجائے اب وہ ریشمی شلوار اور قمیص پہنے ہوئے تھی۔ اور قمیص پر ایک عنابی رنگ کا دھنسا ہوا سویٹر جس نے اس کے سینے کے ابھار کو بہت نمایاں کر دیا تھا۔ کاندھوں پر ایک ریشمی دوپٹہ والہانہ انداز میں پڑا ہوا تھا۔

چائے کی میز پر بیٹھتے ہوئے نرمل نے کہا "تو آپ شلوار قمیص بھی پہنتی ہیں؟"

"جی ہاں۔ مجھے پنجابی لباس بہت پسند ہے۔"

"اور پنجابی؟" نرمل نے ہمت کر کے سوال کر ہی دیا۔

شیریں نے چائے انڈیلتے ہوئے ایک انفرئی قہقہے کے ساتھ جواب دیا
"یہ آپ پر منحصر ہے ——— آپ پہلے پنجابی ہیں جن سے میری ملاقات ہوئی ہے۔"

ڈومیل کا ڈاک بنگلہ ایک نہایت پر فضا مقام پر واقع تھا نیچے دریا بہتا تھا۔ جس کے دوسری طرف ایک اونچی پہاڑی دیوار کی طرح کھڑی تھی۔

سورج غروب ہونے میں ابھی کچھ وقت تھا۔ چائے پی کر نرمل اور شیریں دریا کے کنارے ٹہلنے چلے گئے۔ دریا کے اوپر کچھ فاصلے پر ایک معلق پل بنا ہوا نظر آیا۔ جھولے کی طرح موٹے موٹے تاروں میں لٹکا ہوا۔

شیریں نے کہا "آئیے اس پل پر سے دوسری طرف چلیں"
نرمل نے کہا "چلیے۔ مگر آپ کو ڈر تو نہ لگے گا؟"
شیریں نے کہا "آپ نے مجھے سمجھا کیا ہے؟"

پھر بھی جب شیریں نے پل پر پہلا قدم رکھا اور جھولے کی طرح سارا پل تھر تھرا اٹھا تو اس کے منہ سے ایک ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ نرمل نے فوراً اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے سہارا دیا۔ اور پھر وہ دونوں ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ہنستے ہنستے، ڈگمگاتے پل کے وسط میں پہنچ گئے۔

پچاس فٹ نیچے دریا ڈھلوان، پتھریلی سطح پر نہایت تیزی سے بہہ رہا تھا۔ چٹانوں سے ٹکرا کر پانی میں سبزی مائل جھاگ اٹھ رہا تھا۔

"کتنا حسین منظر ہے" نرمل نے کہا۔ مگر شیریں سے کوئی جواب نہ پایا وہ ایک ہاتھ سے لوہے کے موٹے تار کو مضبوطی سے تھامے اور دوسرا ہاتھ سہارے کے لئے نرمل کے شانے پر رکھے، نظر جھکائے دریا کو دیکھ

رہی تھی۔

چند منٹ تک وہ اسی طرح کھڑے رہے۔ نرمل نے نرمی سے پوچھا "کیا سوچ رہی ہیں آپ؟"

شیریں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ سوچ رہی تھی۔ یہ پنجابی نوجوان کتنا اچھا ہے۔ کتنا مہذب۔ کتنا شیریں گفتار۔ اس کی باتیں کتنی دلچسپ ہیں۔ اس کے خیالات کتنے بلند ہیں۔ غریب ضرور ہے مگر اس کا دل امیر ہے۔ اصل دولت دل اور دماغ ہی کی ہوتی ہے۔ اور میرے ماں باپ کو دیکھو کہ مجھے اس بدمذاق کھوسٹ کرسٹ جی اور کہاں نرمل! وہ سوائے اپنی دولت مندی کے اظہار کے اور کچھ جانتا ہی نہیں۔ جب دیکھو رعب ڈالنے کی کوشش کرتا ہے' میں نے نئی کار لی ہے۔ پیکارڈ۔ بالکل نیا موڈل "کل ریس میں دس ہزار ہار گیا۔ مگر کچھ پروا نہیں' لا فانز گیا تھا۔ دس نئے سوٹ آرڈر کئے ہیں' اور نرمل کو دیکھو۔ اس کے پرانے اوورکوٹ میں کئی جگہ رفو کیا ہوا ہے۔ کپڑے بالکل معمولی ہیں۔ مگر کتنا بھلا معلوم ہوتا ہے۔ اس کے بال کتنے اچھے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے نہ کبھی تیل ڈالتا ہے نہ کنگھی کرتا ہے۔ مگر ان مصنفوں اور آرٹسٹوں کی تو یہی شان ہوتی ہے۔ اس لاپرواہی میں بھی کتنی دلکشی ہے! اور وہ کرسٹ جی! سر گنجا ہونے پر بھی رہے سہے بالوں کو تیل سے چپڑے رہتا ہے" اور کرسٹ جی کے گنج کا خیال آتے ہی وہ مسکرا دی۔

کیوں آپ کیا سوچ کر مسکرا رہی ہیں؟

"کچھ نہیں۔ ایسے ہی۔ نہ جانے کیوں میں اتنی خوش ہوں"

اور وہ سوچ رہی تھی۔ اچھا ہی ہوا میں ماں باپ سے لڑ کر یہاں بھاگ آئی۔ نہیں تو وہ جبر کر کے کسی نہ کسی طرح کرسٹ جی سے میری شادی کر ہی دیتے اور میرے رومان بھرے خواب خاک میں مل جاتے۔ مگر اس وقت میں اس کوسٹ کرسٹ جی کا خیال کر کے کیوں اپنا وقت ضائع کر رہی ہوں؟
نظر اٹھائی تو نرمل کو مسکراتا پایا "اب آپ بتایئے آپ کیوں مسکرا رہے ہیں؟"

نرمل نے کہا "آپ کا چہرہ بھی سینما کے پردے کی طرح ہے جس پر ہر لمحے سین بدلتا رہتا ہے۔ ابھی ابھی آپ مسکرا رہی تھیں۔ پھر کسی سوچ میں ڈوب گئیں۔ اور آپ کی پیشانی پر بل پڑ گئے"

شیریں نے نرمل کے شانے پر خفیف سا دباؤ بڑھاتے ہوئے کہا۔
"چلیے واپس چلیں۔ دیر ہو رہی ہے"

سورج سامنے والی پہاڑی کے پیچھے گم ہو چکا تھا۔ سرسبز پہاڑیاں کالی پڑ گئی تھیں۔ شام کے سناٹے میں دریا کے بہاؤ کا شور اور بھی زیادہ معلوم ہوتا تھا۔ پل پر سے اتر کر وہ پگڈنڈی پگڈنڈی ڈاک بنگلے کی طرف چلے۔ فاصلہ زیادہ نہ تھا۔ مگر راستہ بھول گئے اور کسی اور بنگلے کے قریب جا نکلے۔ وہاں سے ٹھیک راستہ معلوم کر کے چلے تو اندھیرا چھا چکا تھا۔ صرف تیسری رات کے چاند اور ستاروں کی مدھم روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ شیریں اب بھی نرمل کے شانے کا سہارا لئے ہوئے تھی۔ کتنا اچھا لگتا تھا اس طرح چلنا۔ غیر شعوری طور پر نرمل کا دایاں بازو شیریں کی کمر کے گرد لپٹ گیا اور اس کا جی چاہا کہ

رات بھر وہ راستہ بھول کر یوں ہی چلتے رہے۔ کچھ عجیب کیف کچھ عجیب سکون تھا اس قرب میں۔ کچھ عجیب سی کرب آمیز لذت!

ڈاک بنگلے کے قریب آکر وہ آپ سے آپ علیحدہ ہو گئے۔ مگر اس علیحدگی میں آئندہ قربت کا وعدہ تھا۔

کھانا کھا کر وہ کچھ دیر برآمدے میں بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ شیریں نرمل کی ادبی مصروفیتوں کے بارے میں سوال کرتی رہی۔ اور نرمل جو گوبندی سے کبھی اس قسم کی باتیں نہ کر سکا تھا آج نہ جانے کس رو میں بہتا چلا گیا۔ جو کچھ اس نے لکھا تھا، جو لکھنا چاہتا تھا وہ سب بیان کر ڈالا۔ کہانیاں، ناول، ڈرامے، نظمیں۔ اس کے دماغ میں کتنے منصوبے تھے۔ کتنی خواہشیں، امیدیں، امنگیں، مگر آج تک اس نے ان کو اپنے سینے میں دفن کر رکھا تھا۔ اس کے دوست اور دفتر کے کلرک اس کی باتوں پر ہنستے تھے۔ گوبندی ان باتوں کو سمجھنے کی اہلیت ہی نہ رکھتی تھی۔ مگر شیریں نہ صرف دلچسپی سے اس کی باتوں کو سنتی رہی بلکہ تعریفی الفاظ اور معقول مشوروں سے اس کا حوصلہ بھی بڑھاتی رہی۔ وہ سوچ رہی تھی —— "نرمل ادب کی کان کا ایک ناتراشیدہ ہیرا ہے۔ میں اپنے اثر سے اس کو آسمان شہرت پر پہنچا سکتی ہوں" اور نرمل سوچ رہا تھا "ایسی حسین، ذہین اور ہمدرد لڑکی رفیق زندگی ہو تو انسان کیا کچھ نہیں کر سکتا"

دس بجے شیریں تو "گڈ نائیٹ" کہہ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ مگر نرمل دیر تک آرام کرسی پر لیٹا مسرت بھرے خیالات میں گم رہا۔ سردی چمک اٹھی تھی بارہ بجے کے قریب وہ اٹھا اور اپنے کمرے میں چلا گیا۔ سونے سے بیشتر

اس کا آخری خیال یہ تھا کہ "جس دنیا میں شیریں ایسی ہستی موجود ہو وہ کتنی حسین دنیا ہے!"

اگلی صبح جب وہ لاری میں سوار ہوئے تو دونوں کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ برسوں کے دوست ہیں۔ نرمل ہی نے شیریں کا اسباب رکھوایا، اس کی شال، بٹوہ، دستانے، مفلر اس کو لا کر دیئے۔ اس کو مفلر لپیٹ لینے کی ہدایت کی کیونکہ ہوا بہت ٹھنڈی تھی۔ شیریں نے نرمل سے کہا کہ وہ بھی اپنے اوورکوٹ کا کالر چڑھا لے اور سر پر ہیٹ رکھ لے۔ ان دونوں کو ایک دوسرے میں اتنی دلچسپی لیتے دیکھ کر دوسرے مسافر اور ڈرائیور ان کی طرف معنی خیز نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ گر نرمل کو آج ان نگاہوں کی کوئی پرواہ نہ تھی۔

لاری روانہ ہوئی۔

سڑک اور بھی پیچیدہ ہو گئی۔ ایک کے بعد دوسرے میل کا نشان آتا گیا اب وہ اونچی پہاڑیوں پر چڑھتے اترتے چلے جا رہے تھے سڑک ناگن کی طرح بل کھاتی چلی جا رہی تھی۔ چکر۔ لاری کی گوں گوں۔ ایک چکر کے بعد دوسرا چکر۔ تیسرا چکر۔ اور پھر شیریں کی نازک مزاجی۔ ایک بار نرمل نے اس کی طرف دیکھا۔ شیریں کا چہرہ پیلا پڑ رہا تھا۔

"کیوں۔ کیا بات ہے؟"

"کچھ نہیں۔ یہ کم بخت چکر کب ختم ہوں گے؟"

اور دفعتاً نرمل کے کان میں کسی جانی بوجھی آواز نے کہا "اس کی پتلی

میں میں نے سپاری، الائچی، سونف اور لونگیں رکھ دی ہیں۔ سنا ہے پہاڑ پر جب موٹر چڑھتی ہے تو چکر آنے لگتے ہیں۔ متلی بھی ہوتی ہے ...... آپ کے نہیں تو شاید کسی اور ہی کے کام آجاتے۔" جلدی سے اس نے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور اندر ہی اندر تھیلی میں سے سپاری الائچی اور دو چار لونگیں نکال کر شیریں کو دیں۔

"اب کھا لیجئے۔ آپ کی طبیعت فوراً ٹھیک ہو جائے گی۔"

"ٹھیک ہے۔"

شیریں کے منہ سے الائچی کی بھینی بھینی خوشبو اڑ کر ہوا میں پھیل گئی اور نرمل کو ایسا محسوس ہوا کہ کوئی الائچی اتنی خوشبودار ہو ہی نہیں سکتی۔

"اب کیا حال ہے؟"

"اب بہتر ہوں۔" اس کے گالوں پر سرخی پلٹ آئی تھی۔ سڑک کے چکر بھی اب کم ہو گئے تھے۔ اور دور برفیلے پہاڑوں سے آئی ہوئی ٹھنڈی ہوا فرحت بخش تھی۔

شیریں نے نرمل کی طرف تشکر بھری نظروں سے دیکھا۔ اُف ان حسین آنکھوں میں اتنا خلوص، کتنا بھولاپن تھا!

اب سڑک اتنی بلندی پر پہنچ گئی تھی کہ موٹر تقریباً بادلوں میں سے گزر رہی تھی۔ چاروں طرف دھندھی دھند چھائی ہوئی تھی۔ دیودار اور چیڑ کے درخت سورج کو چھپائے ہوئے تھے۔ زمین گیلی تھی۔ شاید رات کو یہاں بارش ہو چکی تھی۔

"اُفوہ کتنی سردی ہو رہی ہے!" شیریں نے کہا "لائیے یہ شال ڈال لیں۔" یہ کہہ کر اس نے ملائم خوبصورت سرمئی رنگ کی شال اپنی اور نرمل کی ٹانگوں پر ڈال دی۔

دُھند اتنی کثیف تھی کہ موٹر سے گز بھر آگے کچھ نظر نہ آتا تھا۔ لاری رینگتی راستہ ٹٹولتی، آگے بڑھ رہی تھی۔

شال کے نیچے نرمل کو اپنے بائیں ہاتھ پر ایک لطیف نازک لمس محسوس ہوا۔ مگر اس کو کوئی تعجب نہ ہوا۔ جیسے وہ اس کا پہلے ہی سے منتظر تھا۔

شیریں کا ہاتھ برف کی طرح ٹھنڈا ہو رہا تھا۔ نرمل نے اسے اپنے گرم ہاتھ میں اس طرح لے لیا جیسے کوئی بچے کو گود میں لے کر یا کبوتر کو ہاتھ میں لے کر تھپکی دیتا ہے۔

کتنا چھوٹا سا، پیارا سا ہاتھ تھا شیریں کا۔ اس کے نرم دباؤ میں کتنی محبت، کتنی گرمجوشی اور معصومیت تھی۔ اس میں دنیا کی ازلی اور ابدی مسرتوں کا پیغام تھا۔ اس میں دعوت بھی تھی اور وعدہ بھی۔

لاری دھند کو چیرتی ہوئی اوپر چڑھتی جا رہی تھی۔ شیریں خاموش تھی کائنات خاموش تھی۔ نرمل نے آنکھیں بند کر لیں۔ اب وہ مسافروں سے بھری ہوئی لاری میں تھا بلکہ ایک طلسمی کشتی میں شیریں کے ساتھ بادلوں میں تیرتا ہوا لامتناہی بلندی کی طرف چلا جا رہا تھا۔

اتار

اترائی کتنی تکلیف دہ، کتنی ناخوشگوار تھی!

لحظہ بہ لحظہ گرمی زیادہ ہوتی جا رہی تھی۔ گلمرگ سے جب وہ صبح سویرے چلے تو سردی کے مارے کانپ رہے تھے۔ سری نگر پہنچتے پہنچتے دھوپ نکل آئی اور اوورکوٹ اتار دینے پڑے۔ سری نگر سے جب وہ دوسری لاری میں چلے تو نرمل اپنا اوورکوٹ پہنے ہوئے تھا اور شیریں اپنا سرمئی سویٹر۔ مگر بارہمولا پہنچتے پہنچتے ان کپڑوں میں بھی گرمی محسوس ہونے لگی۔

"آخر کوٹ کیوں نہیں اتار دیتے؟" شیریں نے کہا۔

بات معقول تھی۔ مگر نہ جانے کیوں نرمل کو شیریں کے لہجے میں کسی قدر درشتی معلوم ہوئی۔ پھر سوچا "نہیں شائد میرے کانوں کا قصور ہو۔"

اس نے کوٹ اتار کر گود میں رکھ لیا۔ آپ سے آپ اس کے ہاتھ نے شیریں کے ہاتھ کو تلاش کر لیا۔ وہی چھوٹا سا، نازک سا ہاتھ۔

سڑک ہموار وادی میں سے چلی جا رہی تھی۔ دونوں طرف سفیدے کے قدآور درخت سنتریوں کی طرح تنے کھڑے تھے۔ دور دھوپ میں گلمرگ کے پہاڑوں کی برف پوش چوٹیاں چمک رہی تھیں۔ ایک کے بعد دوسرے میل کا نشان آتا جا رہا تھا۔ یہ اس کی زندگی کے سب سے اہم، سب سے زیادہ مسرت بھرے سفر کے سنگ راہ تھے۔ ایک مہینہ ہوا وہ ان کو گنتا ہوا کشمیر پہنچا تھا۔ اور اب ایک ماہ بعد ان کو گنتا ہوا واپس آ رہا تھا۔

ایک مہینہ۔ تیس دن۔ ایک دن میں چوبیس گھنٹے۔ مگر زندگی کو مہینوں دنوں، گھنٹوں کے حساب سے نہیں ناپا جا سکتا۔ صرف زندہ رہنا ہی زندگی

نہیں ہے۔ یوں تو جانوروں کی بھی زندگی ہوتی ہے۔ کہتے ہیں پودوں کی
بھی زندگی ہوتی ہے۔ مگر انسان کی زندگی جذبات اور محسوسات کے مجموعے
کا نام ہے۔ ایک لمحے میں حیات جاودانی کا نچوڑ مل سکتا ہے اور ایسا بھی
ہوتا ہے کہ تیس برس انسان رہنے پر بھی زندگی سے محروم رہے۔ کشمیر آنے
تک نرمل بھی بس جی رہا تھا۔ حیوانوں یا پودوں کی طرح۔ کھاتا تھا۔ پیتا تھا۔
سوتا تھا، دفتر جاتا تھا، واپس آتا تھا۔ اس بے کار اور بے روح دوڑ دو
دھوپ سے اکتا جاتا تو ایک افسانہ یا نظم لکھ کر ایک نقلی، رومانی دنیا میں
اپنے کو کھو دینے کی کوشش کرتا۔ مگر اصل اور نقل میں وہی فرق تھا۔ جو
شیریں اور گوبندی یا آسمان اور زمین میں تھا۔ ایک مہینے تک وہ دونوں
ساتھ رہے تھے۔ پچھلے تیس دن ایک دلکش فلمی افسانے کی طرح اس
کی نظر کے سامنے پھر گئے۔ پُرسکون ڈل کی سطح پر شکارے کی سیر۔
شیریں کا سر اس کے زانو پر۔ شالیمار میں ایک چنار کے سائے میں پکنک۔
گلمرگ کا مخملیں سبزہ۔ جس پر لیٹے لیٹے انہوں نے پورے دن
گذارے تھے۔ کھلن مرگ تک گھوڑوں پر چڑھائی۔ وہاں سے الپتر۔
سفید سفید برف پوش پہاڑیاں۔ نیلی جھیل اور اس میں برف کے تودے تیرتے
ہوئے۔ اور شیریں کی قربت سے ان سب نظاروں میں دگنی دلکشی پیدا ہو جاتی
قدرت حسین تھی۔ مگر قدرت کا حسین ترین شاہکار خود شیریں تھی کتنی کیف آور
تھی اس کے بالوں کی مہک۔ کتنی خوبصورت تھیں اس کی آنکھیں۔ کتنے
نازک اور نرم تھے اس کے ہاتھ۔ نازک اور سبک اور برف کی طرح ٹھنڈے۔

نہیں ٹھنڈے نہیں گرم۔ پسینے سے نم آلودہ۔

ایک جھٹکے کے ساتھ نرمل خیالی سے اصلی دنیا میں آگیا۔ شیریں کا ہاتھ ابھی تک نرمل کے ہاتھ میں تھا۔ اور دونوں ہاتھ پسینہ میں تر تھے۔ "میں بھی کتنا بیوقوف ہوں۔ اس گرمی میں بیچاری کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے بیٹھا ہوا ہوں" یہ سوچ کر اس نے شیریں سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ مگر نہ جانے کیوں اسے ایسا محسوس ہوا کہ شیریں کو اپنے ہاتھ کا چھٹکارا اچھا معلوم ہوا۔

شیریں سوچ رہی تھی۔ ایک وہ دن تھا کہ نرمل میرے ہاتھ کو چھو لینا بھی اپنی خوش قسمتی سمجھتا تھا۔ اور آج اس کو میرا ہی ہاتھ برا لگنے لگا ہے۔ اس نے اپنے ہاتھ کو دیکھا تو سرخ اور پسینے سے تر پایا۔ اپنا رومال نکال کر اس نے نرمل کو جلانے کے لئے ہاتھ کو دیر تک رگڑ رگڑ کر خشک کیا۔

"اچھا۔ اب ہمارا پسینہ بھی اتنا برا لگتا ہے!" نرمل نے سوچا اور جلن میں اس نے بھی رومال نکال کر اپنا ہاتھ خشک کر لیا۔

ڈرائیور نے پٹرول بچانے کے لئے انجن بند کر دیا تھا اور لاری ڈھلان پر آپ سے آپ لڑھکتی ہوئی تیزی سے نیچے جا رہی تھی۔

"شیریں۔ تم نے گھر خط لکھ دیا تھا؟" یہ سوال غیر ضروری تھا۔ مگر نرمل نے پوچھ ہی لیا۔

"کتنی بار تو کہہ دیا۔ ہاں۔ ہاں۔ ہاں۔" شیریں کو گرمی، پٹرول کی بو اور موٹر کے چکروں سے کوفت ہو رہی تھی اس لئے غصہ نرمل پر اتارا۔ وہ نرمل کو بتا چکی تھی کہ اس نے اپنی ماں کو لکھ دیا ہے کہ وہ کرسٹ جی کے

بجائے نرمل سے شادی کرنا چاہتی ہے۔ اور وہ چاہتی بھی یہی تھی۔ مگر اس بات کو بار بار دہرانے سے اس کو چڑ سی ہوگئی تھی۔ کیونکہ اس کا بیان سچ بھی تھا اور جھوٹ بھی۔ خط اس نے ضرور لکھا تھا اور اسی مضمون کا۔ مگر ابھی تک ڈاک میں ڈالا نہ تھا۔ آخری لمحے میں وہ نہ جانے کیوں متذبذب ہوگئی تھی۔ اور اس نے یہ سوچ کر اسے بیگ میں رکھ لیا تھا کہ لاہور میں کئی روز تو ٹھیرنا ہی ہے وہاں سے بھیج دیا جائے گا۔

نرمل نے شیریں کو یہ نہ بتایا تھا کہ اس کی شادی ہو چکی تھی اور اس نے وہ جھوٹ نہ سمجھا تھا۔ کیونکہ گوبندی سے اس کی شادی مارے باندھے کی تھی۔ اب اس نے طے کر لیا تھا کہ گوبندی اور لاہور اور جلال پور جٹاں کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ کر وہ بمبئی چلا جائے گا۔ وہاں اس کو کسی فلم کمپنی میں افسانہ نگار اور مکالمہ نویس کی جگہ ملنے کی کافی امید تھی۔ پھر شیریں سے سول میرج کر کے وہ اپنی ساری عمر وہیں گزار دے گا۔ یہ تھا اس کی آئندہ زندگی کا خوش آئند پروگرام۔

بارشوں کا زمانہ ختم ہو چکا تھا۔ اب آسمان صاف تھا اور زمین خشک۔ باوجود اس کے کہ وہ اب بھی تین چار ہزار فٹ کی بلندی پر تھے۔ دھوپ کافی تکلیف دہ ثابت ہو رہی تھی۔ دوسری طرف سے کوئی موٹر یا لاری آتی تو گرد و غبار کا ایک بادل اڑاتی ہوئی اور نہ صرف ان کے کپڑے دھول میں اٹ جاتے بلکہ مہین مہین گرد ان کے منہ اور نتھنوں میں بھی گھس جاتی۔ شیریں اس مصیبت سے بچنے کے لئے اپنے سر پر باندھنے کے ریشمی رومال کو منہ پر نقاب کی

طرح اوڑھے ہوئے تھی۔ ایک بار رومال ہٹایا تو چہرہ پسینہ میں نہایا ہوا تھا۔

"بے چاری" نرمل نے محبت سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے سوچا۔ اور پھر شیریں سے مخاطب ہو کر کہا "یہ کھڑکی کے پاس گرد زیادہ آ رہی ہے تم چاہو تو اِدھر آ جاؤ"

انہوں نے نشستیں تبدیل کریں۔ ان کے جسموں میں اس بار بھی ایک دوسرے سے ٹکرا اور رگڑ ہوئی مگر اب نرمل کو وہ پُر کیف سنسناہٹ نہ محسوس ہوئی جو ایک مہینے پہلے ہوئی تھی۔ نہ جانے کیوں!

بیچ کی سیٹ پر اطمینان سے بیٹھ کر شیریں نے اپنا بیگ کھولا اور اس میں سے پاؤڈر پف نکالا۔ نرمل نے دیکھا کہ شیریں کے گالوں پر پسینہ کی وجہ سے پاؤڈر کی تتیاں سی بن گئی ہیں۔ سرخی بہہ کر نہ جانے کہاں سے کہاں پہونچ گئی ہے ہونٹوں کی لپ اسٹک کہیں لگی ہوئی تھی اور کہیں سے غائب ہو گئی تھی۔ کمان دار ابروؤں کے اوپر ہلکی سی نیلی سی کائیں نمودار تھیں۔ کئی دن سے شائد ان کو موچنے سے باریک نہ بنایا گیا تھا۔ جس چہرے کو دیکھ کر کبھی نرمل کی نبض تیز ہو جایا کرتی تھی آج اس کو دلکش نہ معلوم ہوا، نہ جانے کیوں!

شائد شیریں کو نرمل کے خیالات کا اندازہ ہو گیا تھا اسی لئے وہ جلدی جلدی پاؤڈر اور سرخی کی مدد سے اپنے چہرے کی "مرمت" کر رہی تھی۔ نرمل نے ایک بار کہا تھا کہ شیریں سے ملنے سے پہلے اسے ان لڑکیوں سے نفرت تھی جو پاؤڈر اور لپ اسٹک لگاتی ہیں۔ "تمہاری بات اور ہے!" اس نے کہا تھا۔ مگر شیریں کو شبہ تھا کہ نرمل اب بھی اس قسم کے سنگھار

کو ناپسند کرتا تھا۔ اس لئے ایسے موقعہ پر وہ ہمیشہ کچھ خفیف سی ہو جاتی تھی۔
اور پھر اپنی نگاہ میں اپنی وقعت برقرار رکھنے کے لئے وہ سوچتی "نرمل قابل اور ذہین سہی۔ مگر آخر وہ گنوار ہے بمبئی جیسے شہر کی "سوسایٹی" میں ملا جلا ہوتا تو اس کا ذہن اس قسم کے تعصبات سے پاک ہوتا"! اور یہ خیال آتے ہی وہ سوچنے لگتی کہ بمبئی جاکر وہ اپنے دوستوں کے حلقے میں نرمل کو کس طرح متعارف کرائے گی "! اور اگر نرمل نے انھیں پسند نہ کیا؟ یا انہوں نے نرمل کو ناپسند کیا؟" یہ سوال اکثر اس کے دماغ میں پیدا ہوتا مگر وہ اس کو اپنے شعور کے پچھلے کونے میں ٹھونس دیتی۔

لاری کے سفر میں اگر انجن نہ بگڑے تو پنکچر ہونا تو لازمی ہوتا ہے۔ گھنٹہ بھر سے زیادہ رکنا پڑا۔ پہلی بار نرمل اور شیریں نے دوسرے مسافروں کو دیکھا۔ دو ایک تو وہی تھے جو پچھلی بار بھی ان کے ہم سفر رہ چکے تھے اور ان دونوں کی طرف معنی خیز نگاہوں سے دیکھ کر آپس میں کھسر پسر کر رہے تھے۔ ایک گورا سا بڑی ناک والا نوجوان تھا۔ فلم ایکٹروں جیسی مونچھیں بنائے ہوئے۔ سر پر بانکا فیلٹ ہیٹ۔ گلے میں ریشمی مفلر اور کوٹ کے بجائے ہوائی جہاز کے "پائلٹوں" جیسی چمڑے کی آستینوں والا جاکٹ۔ منہ میں پائپ۔ شیریں کو دیکھ کر یہ شخص اس طرح آگے بڑھا جیسے کوئی شکاری پرندہ اپنے شکار پر جھپٹتا ہے۔

"آپ مس باٹلی والا ہیں نا؟" اس نے پہلے انگریزی میں پوچھا اور شیریں کا جواب پاکر اس نے نہایت بے تکلفی سے ہاتھ ملاکر گجراتی میں باتیں

کرنی شروع کر دیں۔ ایم چھے۔ کیم چھے۔ سوں چھے۔ سارو چھے۔ یہ چھے۔ وہ چھے! نرمل کی سمجھ میں خاک نہ آیا کہ وہ کیا باتیں کر رہے تھے۔ بیچ میں شیریں نے نرمل کا تعارف بھی کرایا "یہ میرے دوست ہیں مسٹر نرمل کمار۔ کشمیر میں ہماری ملاقات ہوئی۔ اور آپ ہیں مسٹر دارو والا۔ موٹروں کا کاروبار کرتے ہیں اور تمام بمبئی میں سب سے اچھا ٹینگو ڈانس کرتے ہیں۔"

"آپ خود کیا بُرا ناچتی ہیں۔ پچھلے کرسمس پہ یاد ہے جب تاج میں کوکا کو اور آپ کو انعام ملا تھا" اور پھر نرمل کی طرف مخاطب ہو کر "ہاں تو مسٹر کمار مجھے یاد پڑتا ہے ہم کہیں ملے ہیں۔ ہاں خوب یاد آیا۔ تاج کے بار روم میں نہیں تو ہیں کرکیٹ کلب میں" اور جب نرمل نے عاجزی سے جواب دیا کہ تاج اور کرکیٹ کلب کیا اس نے تو کبھی بمبئی شہر ہی نہیں دیکھا تو مسٹر دارو والا نے پھر شیریں کی طرف پوری توجہ مبذول کر کے ایم چھے۔ کیم چھے کا سلسلہ شروع کر دیا۔

کچھ دیر تو نرمل بیوقوفوں کی طرح کھڑا ان کی گجراتی گفتگو کا مفہوم سمجھنے کی کوشش کرتا رہا۔ مگر "تاج" "گرین" "سی سی آئی" "مہالکشمی" "ریس کورس، گولڈن فان" کے سوا کوئی لفظ سمجھ میں نہ آیا۔ ایک بار اس کو شبہ ہوا کہ وہ دونوں شائد سیاست کے متعلق باتیں کر رہے ہیں کیونکہ "سٹالن" اور "چرچل" کے نام بار بار لئے جا رہے تھے۔ مگر پھر "بٹینگ" کا ذکر ہوا تو پتہ چلا کہ یہ گھوڑ دوڑ کے گھوڑے تھے نہ کہ سیاستداں! نرمل محبت کے معاملے میں "احساس ملکیت" اور حسد کا قائل نہ تھا۔ مگر شیریں کا اس اجنبی نوجوان سے گھل مل کر

باتیں کرنا اسے اچھا نہ لگا۔

وہ ٹہلتا ہوا سڑک کے دوسرے کنارے پر چلا گیا جہاں چند اور مسافر پتھروں کی دیوار پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک صاحب نے مشفقانہ انداز میں نرمل سے پوچھا "کیوں بابو جی، یہ بھائی آپ کے ساتھ ہیں یہ آپ کی بیوی ہیں؟" نرمل نے جلدی سے جواب دیا "جی نہیں۔ آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ وہ صرف میری دوست ہیں۔ کشمیر میں ملاقات ہوئی ہے" وہ صاحب زیر لب مسکرا دیئے۔

خدا خدا کرکے لاری روانہ ہوئی تو شیریں سے بات کرنے کا پھر موقع ملا۔ مگر وہ آپ ہی آپ کوئی انگریزی گیت گنگنا رہی تھی۔ نرمل کو اگر کسی چیز سے چڑ تھی تو وہ انگریزی گانا تھا۔

"کیا گا رہی ہو؟"

"ارے تم نے یہ گیت نہیں پہچانا؟ 'ڈاؤن ارجنٹائن وے' میں کارمن مرانڈا گاتی ہے نا!" نرمل نے یہ فلم ہی نہ دیکھا تھا۔ مگر گیت اس کو بے معنی اور لغو معلوم ہوا۔ "ماما یا کیرو۔ ماما یا کیرو"

"بھلا یہ بھی کوئی گانا ہے! مجھے تو بکواس معلوم ہوتا ہے"

"تمھیں تو ہر انگریزی چیز بکواس معلوم ہوتی ہے"

نہ جانے کیوں دونوں کے طرز گفتگو میں درشتی سی آتی جا رہی تھی۔ شاید گرمی کے اثر سے جو ہر لمحہ بڑھتی جا رہی تھی!

شیریں سوچ رہی تھی "یہ بھی کوئی بات ہے کہ انگریزی ناچ نہ

ناچو انگریزی گانا نہ گاؤ۔ آخر زندگی میں یہی تو دو چار دلچسپ چیزیں ہیں۔
نرمل سوچ رہا تھا "کیا بمبئی جاکر اور شیریں کے دوستوں —— دارو والا جیسے دوستوں —— کی صحبت میں رہ کر مجھے بھی انگریزی ناچ گانے کی عادت ڈالنی پڑے گی؟"

شیریں کے ساتھ پُرمسرت زندگی گزارنے کے ہوائی قلعے جو اس نے اپنے دماغ میں بنائے تھے۔ دارو والا سے مل کر کچھ متزلزل سے ہو گئے تھے۔ کیا شیریں کے سب دوست اسی قسم کے ہوں گے؟ کیا اس کے ساتھ وہ ایسا ہی سلوک کریں گے؟ تیس دن ان دونوں نے ایک دوسرے کی صحبت اور رفاقت میں ہنسی خوشی گزارے تھے۔ انہوں نے اپنے دلوں اور دماغوں میں ہم آہنگی پائی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ قدرت نے ان دونوں کو ایک دوسرے کے لئے ہی بنایا تھا۔ مگر جو لڑکی دارو والا سے ہنس ہنس کر گھوڑ دوڑوں اور ناچ گھروں کی باتیں کر رہی تھی وہ تو کوئی اور ہی شیریں تھی۔ جس سے وہ اب تک بالکل نا واقف رہا تھا۔ کیا اس شیریں سے بھی عمر بھر کا نباہ ممکن تھا؟

عمر بھر کا نباہ! گوبندی سے بھی تو اس کو عمر بھر کا نباہ کرنا تھا۔ بے چاری گوبندی! جو انگریزی گانا تو کیا ہندوستانی گانا بھی نہ جانتی تھی۔ جو صرف روٹی پکانا جانتی تھی۔ اس نے گوبندی سے کہا تھا۔ "میں کشمیر جا رہا ہوں۔ مہینہ بھر کے لئے۔ تم جلال پور جٹاں چلی جاؤ۔" اور اس نے جواب دیا تھا "بڑی اچھی بات ہے۔ کشمیر جاکر آپ کی صحت بھی اچھی ہو جائیگی

یہاں کام بھی تو بہت کرتے ہیں آپ ۔ دن بھر دفتر میں مغز مارنے کے بعد پھر رات کو بھی لکھنے بیٹھ جاتے ہیں ۔" اور ایک بار بھی گو بندی نے یہ نہیں کہا تھا کہ " مجھے بھی لے چلئے کشمیر ۔" کہا تھا تو بس یہ کہ " اس تھیلی میں میں نے سپاری ، الائچی ، سونف اور لونگیں رکھ دی ہیں ۔ سنا ہے پہاڑ پر جب موٹر چڑھتی ہے تو چکر آنے لگتے ہیں ۔" اور اس بار گو بندی کے الفاظ کو یاد کر کے وہ غصہ ہونے کے بجائے مسکرا دیا ۔

" کیا بات ہے جو آپ ہی آپ مسکرائے جا رہے ہو ؟"

" کچھ نہیں ۔" اس نے جھوٹ بولا " یونہی ۔ کوئی خاص بات نہیں ۔" اور پھر موضوع بدلنے کے لئے " ہاں شیریں یہ تو بتاؤ اپنی والدہ کے نام وہ خط تو ڈال دیا تھا نا ؟" اور نرمل کا جی چاہا کہ شیریں جواب دے " نہیں " نہ جانے کیوں !

" پھر وہی سوال ! کہو تو حلف نامہ لکھ دوں ؟" شیریں کے جواب میں تلخی تھی اور طنز تھا ۔

کچھ دیر پھر خاموشی ۔ دونوں طرف تناؤ ۔ لاری کے پچھلے ڈبے سے دارو والا کے سیٹی بجانے کی آواز آئی ۔ کوئی انگریزی ناچ کی دھن تھی ۔ شیریں کے نازک اونچی ایڑی کے جوتے لاری کے آہنی فرش پر رقص کرنے لگے ۔ نرمل نے سڑک کے کنارے لگے ہوئے درختوں کا جائزہ لینا شروع کر دیا ۔

" نرمل !" اس بار شیریں کی آواز میں نرمی تھی ۔

"ہاں۔ کہو۔ کیا بات ہے؟"

"کیا تمھیں انگریزی ناچ سے واقعی اتنی نفرت ہے؟"

"ہے تو۔ بات یہ ہے کہ میں ٹھیرا گنوار۔ ہندوستانی قسم کا آدمی۔"

اور اسے امید ہوئی کہ اب شیریں کہے گی کہ "ایسا ہے تو تمھاری خاطر میں بھی ناچنا چھوڑ دوں گی"۔ مگر شیریں نے کہا "یہ تو بڑی مشکل ہوئی!" اور پھر خاموش ہو گئی۔

ساڑھے پانچ کے قریب ۵۰ ڈومیل کے ڈاک بنگلے پر پہنچے۔ ڈرائیور نے کہا "آج تو راولپنڈی نہیں پہنچ سکتے۔ رات کو یہیں ٹھیرنا ہوگا" چلے تو تھے اس ارادے سے کہ اسی رات کو راولپنڈی پہنچ جائیں گے مگر ترمل کو ڈومیل ٹھیرنا اچھا معلوم ہوا۔ اس نے سوچا "اسی ڈاک بنگلے میں ہماری محبت کی ابتدا ہوئی تھی۔ اس ماحول میں ہم ایک دوسرے کو پھر پاسکیں گے اور آج کی چلی کٹی باتیں بھول جائیں گے۔"

مگر دارو والا کی مصیبت سر پہ نازل تھی۔ ان کے کمروں کے برابر ہی اس نے بھی کمرہ لیا۔ اور شیریں سے آکر حسب معمول بے تکلفی سے باتیں کرنی شروع کر دیں۔ "دیکھئے۔ آج کل ریل میں رش بہت ہوتا ہے۔ اس لئے سیٹیں ریزرو کرانے کے لئے یہاں سے تار دے دینا چاہئے ورنہ بڑی مشکل میں پڑ جائیں گے۔ کہئے تو تار دیدوں دو فرسٹ کلاس سیٹوں کے لئے؟"

شیریں نے کہا "مسٹر نرمل کمار سے دریافت کر لیجئے۔ ان کو بھی تو

سیٹ ریزرو کرانی ہوگی۔ اور ہاں دیکھئے ایر کنڈیشنڈ کمپارٹمنٹ کے لئے تار دے دیجئے گا۔ ورنہ کشمیر کی سیر کا سب مزا کرکرا ہو جائے گا"

برآمدے میں نرمل یہ باتیں سن رہا تھا۔ اس نے جلدی سے اپنے کمرے میں جاکر اپنے بٹوے کا جائزہ لیا تو صرف ساڑھے گیارہ روپے نکلے۔ تین سو میں بڑی مشکل سے مہینے بھر تک گزارہ ہوا تھا۔ وہ بھی اس طرح کہ شیریں ہمیشہ اپنا خرچ خود اٹھاتی تھی اور کبھی کبھی نرمل کا بھی اب صرف ساڑھے گیارہ روپے رہ گئے تھے۔ ڈاک بنگلے کا کرایہ اور کھانے کے دام دے کر مشکل سے چھ سات روپے بچنے کی امید تھی۔ وہ تو لاہور تک فرسٹ چھوڑ تھرڈ میں بھی نہیں جا سکتا تھا۔ اور شیریں سے روپیہ مانگنا یہ اس کی حمیت کو گوارا نہ تھی۔

"کہئے مسٹر کمار۔ تو آپ کے لئے بھی تار دے دوں ؟" وارڈ والا نے کمرے میں جھانک کر کہا۔

"میرے لئے ..... جی ..... تکلیف نہ کیجئے"

"ارے بھئی اس میں تکلیف کی کیا بات ہے۔ ڈاک خانے تو جا ہی رہا ہوں۔ جہاں دو سیٹوں کے لئے تار دوں گا وہاں تین کے لئے بھی دے سکتا ہوں۔ یا آپ نے پہلے سے سیٹ ریزرو کرا رکھی ہے ؟"

نرمل نے یہ بہانا غنیمت جانا "جی ہاں۔ جی ہاں۔ میں تو پہلے ہی ریزرو کرا چکا ہوں"

اور برابر کے کمرے میں یہ سن کر شیریں کی پیشانی پہ شکن پڑ گئی۔

"اپنی سیٹ ریزرو کرالی اور میرا خیال بھی نہ کیا !"

ڈاک خانہ بند ہو چکا تھا۔ تار نہ جا سکا مگر دارو والا کو بک بک کرنے کے لئے ایک مستقل موضوع مل گیا۔ "عجیب کوفت ہو گئی۔ نہ جانے کل ٹرین میں کوئی فرسٹ کلاس ایر کنڈیشنڈ برتھ ملے بھی یا نہیں۔ یا ممکن ہے سیکنڈ کلاس میں جانا پڑے" اور اس نے سیکنڈ کلاس کا ذکر اس طرح کیا گویا اس درجے میں سفر کرنا اس کی سخت ہتک تھی۔ "مگر مسٹر کمار آپ تو مزے میں رہے پہلے سے انتظام کر لیا۔"

شیریں اندر کمرے میں کپڑے تبدیل کر رہی تھی۔ اس لئے دارو والا کی باتوں سے چھٹکارا پانے کی کوئی صورت نہ تھی۔ اس کی زبان تھی کہ قینچی کی طرح چلتی جا رہی تھی۔ "ارے مسٹر کمار آپ بمبئی آئیے بمبئی۔ پھر آپ کو دنیا کی سیر کرائی جائے۔ میری بات مانئے تو نومبر میں آیئے۔ ریسیں بھی ہوں گی۔ پھر ذرا لطف رہے گا۔ مگر یہ بتائے دیتا ہوں کہ اگر آپ کو نومبر میں آنا ہے تو ابھی سے خط لکھ کر تاج میں کمرہ ریزرو کرا لیجئے ورنہ مشکل پڑ جائے گی۔ تاج میں آپ ہوں گے تو پھر روز ملاقات ہوا کرے گی۔ میں دوپہر کا کھانا اکثر وہیں کھاتا ہوں۔ اور پھر ہر ڈانس نائٹ پر تو ڈنر بھی وہیں ہوتا ہے۔" یہ کہتے کہتے اس نے وہیں برآمدے کی فرش پر ڈانس کے انداز میں تھرکنا شروع کر دیا "او ہائے او ہائے۔ ایسا ڈانس فلور دنیا میں کہیں نہیں ہے۔ . . . مگر آپ تو شاید بامبی والا پیلس میں ٹھہریں گے۔ مالا بار ہل پر۔ اہاہا۔ کیا مکان بنایا ہے مس شیریں کے والد نے۔ ہر چیز ولایت سے منگائی ہے۔ یہاں تک کہ فرنیچر سارا کا سارا

فرانس سے بن کر آیا تھا۔ خوب با مذاق آدمی ہیں۔ مسٹر باٹلی والا بھی۔ گھٹیا چیز کو تو کبھی گوارا کر ہی نہیں سکتے۔"

نرمل کے دماغ میں ایک خیال بجلی کی طرح کوند گیا" بھلا وہ ایک گھٹیا داماد کو کیوں گوارا کرنے لگے!"

شیریں باہر آئی تو دونوں اس کی تعظیم کو کھڑے ہوگئے۔ سری نگر سے چلتے وقت وہ شلوار قمیص پہنے ہوئے تھی۔ مگر اس وقت اس نے ساڑھی باندھی تھی اور وہ بھی خاص پارسی انداز میں۔ دارو والا بولا "تھینک گاڈ۔ آپ نے وہ گنوار کپڑے تو اتارے" اور شیریں نے جواب دیا "کبھی کبھی پہننے کے لئے پنجابی لباس بھی بُرا نہیں ہوتا!"

جھوٹے کے پل پر پھر سبز کو گئے ایک مہینے پہلے کا طلسم ٹوٹ چکا تھا۔ دارو والا کی موجودگی نے ان کو ٹھیک طرح سے بات کرنے کا موقع بھی نہیں دیا۔ واپسی پر شیریں کچھ سوچتی ہوئی بچوں کی طرح زور زور سے بیگ ہلاتی آگے آگے جا رہی تھی اور دارو والا نرمل کے کان کھا رہا تھا "کبھی کپڑے سلوانا ہوں تو لاتا نز میں سلواؤ۔ یہ لاہور کے درزی کیا جانیں سوٹ سینا کسے کہتے ہیں"

اتنے میں شیریں کے ہاتھ سے پھسل کر بیگ کچھ دور جا گرا۔ کلپ کھل گیا اور سب چیزیں بکھر گئیں۔ نرمل اور دارو والا دونوں چیزوں کو چننے کے لئے دوڑے پاؤڈر پف۔ لپ اسٹک۔ بالوں کے پن چند روپے اور نوٹ۔ رومال ...... اور ایک خط: اس سے قبل کہ شیریں اس کو جھپٹ لے نرمل نے پتہ پڑھ لیا "مسز روشن باٹلی والا۔ باٹلی والا پیلس۔ مالابار ہل۔ بمبئی" یہ

وہی خط تھا جو نرمل سے شادی کرنے کے بارے میں اس نے اپنی ماں کو لکھا تھا اور جو اس کے بیان کے مطابق ڈاک میں ڈالا جا چکا تھا۔

"ارے یہ خط! ـــــ وہ ـــــ ڈالنا ہی بھول گئی" جھوٹ بولنے کی ناکام کوشش میں وہ ہکلا رہی تھی۔ مگر نرمل کو اس پر ذرا بھی غصہ نہ آیا۔ یہ دیکھ کر کہ خط ابھی ڈاک میں نہ پڑا تھا اس کو کچھ اطمینان سا ہو گیا۔ اس نے کہا "خیر۔ اب ڈاک میں بھیجنے سے کیا فائدہ۔ اس سے پہلے تو تم خود ہی بمبئی پہنچ جاؤ گی"

اگلے دن سویرے جب لاری ڈرمیل سے روانہ ہوئی تو نرمل نے دیکھا کہ شیریں کے چہرے پر خفت سی تھی۔ بیگ کرنے کے بعد ان دونوں نے اس خط کا کوئی ذکر نہ کیا تھا۔

لاری تیزی سے ڈھلوان پر چلی جا رہی تھی۔ ڈرائیور نے ان سے وعدہ کیا تھا۔ کہ فرنٹیر میل کے روانہ ہونے سے پہلے ہی وہ ان کو راولپنڈی پہنچا دے گا۔

"شیریں!" نرمل نے نرمی سے کہا۔

"ہاں، نرمل!" شیریں کی آواز میں کچھ عجیب افسردگی تھی۔

"تم نے جان کر وہ خط نہ ڈالا تھا نا؟" نرمل نے انگریزی میں سوال کیا تاکہ ڈرائیور ان کی باتیں نہ سمجھ سکے۔

شیریں نے جواب میں آہستہ سے سر ہلا دیا۔

"تم فیصلہ نہ کر پائی تھیں ہمارے بارے میں؟ یہی ہے نا؟" جواب

کی ضرورت نہ تھی۔

"تم نے ٹھیک کیا شیریں۔ میرے تمہارے درمیان ایک دیوار حائل ہے۔ ہم کبھی خوش نہ رہ سکیں گے" اور یہ کہہ کر اس کو ایسا معلوم ہوا جیسے کوئی زبردست بوجھ اس کے سر سے اتر گیا ہو۔

شیریں کچھ دیر خاموش رہی۔ اب راولپنڈی نظر آنے لگا تھا۔ پھر وہ بولی "مگر ہم دوست تو رہیں گے نا؟ مجھ سے خفا تو نہیں ہو؟"

نرمل نے خلوص سے جواب دیا "بھلا یہ ہو سکتا ہے، شیریں۔ تم نے ایک مہینے کے لئے میری روکھی پھیکی زندگی کو کیف آور بنا دیا۔ یہ احسان کم ہے تمہارا؟ تم بھول جاؤ تو اور بات ہے۔ شاید میں کبھی بمبئی آؤں اور تم سے ملنے کے لئے مالابار ہلز پر جاؤں تو تم مجھے دیکھ کر کہو، ہاں یاد آ گیا کہیں دیکھا ہے آپ کو؟"

شیریں نے نرمل کے الفاظ دہرائے "بھلا یہ کبھی ہو سکتا ہے؟"

اور پھر نرمل نے کہا "اچھا تو یاد رکھنا۔ میں آؤں گا تو تم شلوار قمیص پہننا۔ کبھی کبھی پہننے کے لئے پنجابی لباس بُرا نہیں ہوتا؟"

راولپنڈی کے سٹیشن پر پہنچ کر وہ مسافروں کی بھیڑ میں کھو گئے دارو والا نے بھاگ دوڑ کر ایک بابو کی مٹھی گرم کی اور فرسٹ کلاس کے ایک درجے میں دو سیٹوں کا انتظام کر ہی لیا۔ مگر یہ ایر کنڈیشنڈ نہیں تھا۔ اگست کی دوپہر۔ پنکھوں میں سے بھی گرم ہوا نکل رہی تھی۔

ریل چلنے والی تھی کہ نرمل نظر آیا۔ دارو والا نے کہا "کہئے آپ کو

کہاں جگہ ملی ؟"

نرمل نے ٹرین کے دوسرے حصّے کی طرف اشارہ کر دیا۔

"اوہ۔ ایرکنڈیشنڈ ؟ بڑے خوش قسمت ہیں آپ !"

"جی ہاں ، بالکل ایرکنڈیشنڈ درجہ ہے "

گارڈ نے سیٹی دی اور نرمل شیریں اور دارو والا دونوں سے ہاتھ ملاکر اپنے تھرڈ کلاس کے کھچا کھچ بھرے ہوئے ڈبّے میں آکر بیٹھ گیا۔

اب ریل تیزی سے لاہور کی طرف چلی جا رہی تھی۔ نرمل کھڑکی کے پاس بیٹھا ہوا گرم لُو کے تھپیڑے کھا رہا تھا۔ مگر اس تکلیف میں بھی عجیب راحت تھی۔ اب وہ خیالی، جذباتی بلندیوں سے اتر کر زمین پر آگیا تھا۔ حقیقت اس بے گدّے کی سیٹ کی طرح سخت اور غیر آرام دہ تھی مگر بھی جانی بوجھی اور قابلِ اعتبار۔ نرمل کے چاروں طرف دھوپ کے سینکے ہوئے جسموں والے کسان بیٹھے تھے۔ وہ تاج محل اور کرکیٹ کلب کی باتیں نہیں کر رہے تھے بلکہ زمین اور بارش اور فصل کی۔ ایک منشی جی عینک لگائے اخبار میں سے سٹالن اور چرچل کی تازہ ملاقات کا حال پڑھ کر سنا رہے تھے مگر یہ چار ٹانگ والے سٹالن اور چرچل کا ذکر نہیں تھا۔ وہ شرمیلی چودہ برس کی دلہن جو ایک کونے میں بیٹھی تھی اس کے چہرے پر شرم کی لالی تھی، پاؤڈر اور "روژ" کی نہیں! اس درجے میں سچ مچ کے انسان بیٹھے تھے۔ ان کے باپ جیسے کھردرے میلے کچیلے۔ گنوار۔ اَن پڑھ۔ مگر انسان۔ سچ سچ کے انسان محنت مزدوری کرنے والے۔ ٹھوکریں کھانے والے انسان۔

ان کی محبت میں اسے ایک عجیب احساس رفاقت حاصل ہوتا تھا۔ وہ اپنی اور ان کی مفلسی اور پست حالی پہ قانع نہیں تھا۔ مگر اس کو معلوم تھا کہ ان کو نیچے چھوڑ کر وہ خود اوپر چڑھ گیا تو اس کو سچی مسرّت حاصل نہ ہو گی۔

کھیت۔ درخت۔ بجلی کے کھمبے۔ کسانوں کے جھونپڑے۔ گاؤں۔ سٹیشن۔ یہ سب اس کے سامنے سے تیزی سے گھومتے ہوئے چلے جا رہے تھے۔ اور ان سب میں اس کو ایک چہرہ جھانکتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ پیلا پیلا چہرہ۔ چھوٹی چھوٹی آنکھیں۔ منہ پر راکھ کا غازہ۔ کانوں پر چڑھے کی کالونج۔ مگر اس وقت یہ چہرہ اس کو دنیا کا حسین ترین چہرہ معلوم ہو رہا تھا۔ اور اس کے کان ریل کے پہیوں کی گھڑگھڑاہٹ میں برابر ایک ہی آواز سن رہے تھے۔ "کیوں جی! آپ آ گئے؟"

توڑا بھی جاسکتا ہے ۔ بنیا اپنی پارٹی ہی میں کئی ایسی لڑکیوں کو جانتی تھی ۔ جنھوں نے اس خیالی دروازے کو توڑ کر آزاد جنسی تعلقات کی سرزمین میں قدم رکھا تھا ۔ کیا آج کی رات وہ بھی وجے سنگھ کی مدد سے ... ؟ وہ اس خیال ہی سے شرما گئی ۔ ایسی باتیں سوچنی بھی نہیں چاہئیں ۔ مگر کیوں نہیں ۔ وجے سنگھ خوبصورت ہے ، جوان ہے ۔ تندرست ہے اور اس کی آنکھوں میں دلفریب مسرتوں کا پیغام ہے ۔

ٹرین پلیٹ فارم پر پہنچ گئی ۔ بنیا کے خیالات کا تار ٹوٹ گیا اور وہ وجے سنگھ کی تلاش میں ایک سرے سے دوسرے تک دوڑنے لگی ۔ کہیں اس کا پتہ نہ ملا ۔ کسی درجے میں بھی پارٹی کے دفتر والی تصویر سے ملتا جلتا مسافر نہ تھا ۔ ٹرین سے اترا تو بس ایک مجہول شخص ، بڈھا فقیر ۔ دو تو کسان برآمد سے اٹھ کر ایک تھرڈ کلاس کے بھرے ہوئے ڈبے میں گھس گئے انجن نے سیٹی دی اور ٹرین چلدی ۔ تو کیا وجے سنگھ اس گاڑی سے نہیں آیا ؟ کیا اس کو پہلے ہی گرفتار کر لیا گیا ؟ مگر وہ بڈھا کیوں پلیٹ فارم کی لالٹین کے نیچے بنیا کو گھور گھور کر دیکھ رہا تھا ؟

" کیا آپ مس بنیا ہیں ؟ " فقیر کی آواز میں نفاست تھی ۔

اور جب بنیا نے " ہاں " کہا تو اس کی نگاہ بڈھے کی آنکھوں پر پڑی ——— آنکھیں جو ایک جھاڑ جھنکار ڈاڑھی میں سے اس طرح چمک رہی تھیں ۔ جیسے گھنے جنگل میں کسی خوبصورت مکان کی دو کھڑکیاں جگمگا رہی ہوں

" آپ ...... ہی .... کامریڈ وجے سنگھ ہیں ؟

"ہاں - مجھے پارٹی سکریٹری کا تار پچھلے سٹیشن ہی پر مل گیا تھا کہ مجھے اس سٹیشن پر اترنا ہے۔ اور یہ کہ تم مجھے لینے آؤ گی "

"چلیئے "

بینا وجے سنگھ کو اپنے گھر لے آئی۔ کھانا تیار کر کے گئی تھی وہ ایک تھالی میں پروس کے اس کے سامنے رکھ دیا۔ بغیر ایک لفظ کہے اس نے کھانا شروع کر دیا۔ یہ بھی نہیں پوچھا " تم نہیں کھاؤ گی ؟ "

بینا پاس کرسی پر بیٹھ گئی۔ وجے سنگھ انہماک سے کھانے میں مصروف تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اسے کتنے ہی دن کے فاقے کے بعد کھانا ملا ہے۔ بینا کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ یہ سوچ کر کہ سولہ برس تک دھول ملی روٹی اور تیل میں پکی ہوئی دال کھانے کے بعد اس کو آج انسانوں کی خوراک نصیب ہوئی تھی۔ وہ وجے سنگھ کو غور سے دیکھ رہی تھی۔ کیا یہ وہی چوڑے چکلے سینے اونچی پیشانی چکنے بالوں والا وجے سنگھ ہے۔ جس کی تصویر پارٹی کے دفتر کی دیوار پر ٹنگی تھی ؟ نہیں یہ وہ نہیں ہو سکتا۔ اس کا سر گنجا ہے اور اس پر مدتوں تک نہ نہانے کی وجہ سے پھنسیوں اور میل کے کھرنڈ جمے ہوئے ہیں۔ اس کی ڈاڑھی —— آدھی کالی آدھی سفید —— خوفناک طریقے سے اگی ہے۔ ہونٹوں کے اوپر اور نیچے کے بال شائد دال کے دھبے لگتے لگتے زرد ہو گئے ہیں۔ دانت کچھ غائب ہیں اور کچھ زردی مائل۔ ناخن بڑھے ہوئے اور میل سے بھرے ہوئے۔ باوجود شدید احساس ہمدردی کے بینا یہ سوچ کر کانپ اٹھی کہ ٹرین آنے سے چند سکنڈ پہلے ہی وہ اسی شخص کے ساتھ

جنسی زندگی کی پہلی منزل طے کرنے کا ارادہ کر رہی تھی۔

وجے سنگھ نے کھانا ختم کر لیا تو بینا نے کہا اب آپ نہا کر کپڑے بدل لیجئے، پارٹی والوں نے آپ کے لئے یہ کپڑے بھیجے ہیں۔ میں غسل خانے میں گرم پانی رکھ دیتی ہوں۔ یہ سن کر وجے سنگھ نے اپنے پھٹے پرانے کپڑوں پر نظر ڈالی۔ جیسے اس کو دفعتاً اپنی غلاظت کا احساس ہوا بغیر ایک لفظ بولے وہ غسلخانہ میں چلا گیا۔ سولہ برس کا طویل عرصہ اس نے اکیلے کال کوٹھری میں گذارا تھا۔ اسی لئے اس کو انسان سے بات چیت کرنے کی عادت ہی نہ رہی تھی اور بینا جیسی نوجوان لڑکی کی موجوگی میں تو ایسا چپ ہو گیا تھا۔ جیسے گونگا ہے۔

نہا کر وجے سنگھ نے صاف کپڑے پہنے اور انگیٹھی پر ہاتھ تاپنے لگا جو بینا نے سردی کے خیال سے جلا رکھی تھی۔ لال لال کوئلوں کی روشنی میں اس کی آنکھوں میں بینا کو ہلکی سی مسرت کی جھلک دکھائی دی۔ جیسے انگاروں پر سے راکھ جھٹک دی گئی ہے۔ اس نے بینا سے قینچی مانگ کر اپنے ناخن کاٹے اور پارٹی سیکریٹری کا خط پڑھنے بیٹھ گیا۔ بینا کو معلوم تھا کہ اس خط میں پچھلے سولہ سال کے سیاسی واقعات پر تبصرہ ہے۔ انقلابی پارٹی کی کارروائی کی رپورٹ ہے۔ جوں جوں وجے سنگھ اس کو پڑھتا تھا اس کی آنکھوں میں وہی پرانی انقلابی چمک واپس آتی جا رہی تھی۔ غصہ۔ افسوس۔ خوشی۔ سب جذبات اس کی آنکھوں کے آیئنے میں یکے بعد دیگرے نظر آ رہے تھے۔ رپورٹ پڑھتے ہی وہ

انقلابی لیڈر رہتا۔ دوبارہ گرفتار ہونے سے پہلے اس کو اپنی پارٹی کو ہدایات دینی تھیں۔ اُس نے بینا سے کاغذ اور قلم مانگا اور خط کا جواب لکھنے بیٹھ گیا۔ مگر اس کا ہاتھ کانپ رہا تھا۔ چکی چلاتے چلاتے قلم پکڑنے کی عادت ہی نہ رہی تھی۔

خط ختم کرکے اس نے بینا کو دیا کہ اگلے دن حفاظت سے سکریٹری تک پہنچا دے۔

بینا نے گھڑی دیکھی ابھی صرف سوا نو بجے تھے۔ خاموشی توڑنے کے لئے اُس نے کہا "ابھی آپ سونا چاہتے ہیں یا......... یا کچھ دیر اور بیٹھنا ہے؟"

وجے سنگھ کا جواب سُن کر وہ دنگ رہ گئی۔ "میں سینما دیکھنا چاہتا ہوں بولتا سینما۔" دفعتاً بینا کے دماغ میں سولہ برس قید کے ہولناک نتائج کی ایک جھلک بجلی کی طرح کوند گئی۔ سولہ برس ۲۷ء سے ۴۳ء تک یعنی وجے سنگھ نے کوئی ٹاکی ہی نہیں دیکھا تھا۔ نہ اُس نے سہگل کی آواز سنی تھی نہ رمولا کا حسن دیکھا۔ نہ کانن بالا کے رسیلے گانے اور نہ چندر موہن کا کمال اداکاری۔ وہ تو بولتی ہوئی تصویروں کے جادو سے اتنا ہی ناواقف تھا جیسے افریقہ کے تاریک ترین جنگلوں میں رہنے والا۔ سولہ برس وہ زندگی کے دلچسپ اور خوشگوار پہلوؤں سے محروم رہا تھا۔ سینما اور تھیٹر، گانا اور ناچ۔ بچوں کی آواز۔ غروب آفتاب کا رنگین منظر۔ چاند اور ستارے۔ برسات کی رِم جھِم اور گیلی مٹی کی خوشبو۔ درختوں کی چھاؤں۔ پھولوں

کی بہار۔ ماں کی ممتا۔ اولاد کی اُمنگ۔ عورت کا پیار۔ کچھ بھی نہیں۔ بس ایک گندی اندھیری کوٹھری۔ جیل کے افسروں اور وارڈنوں کی کرخت آوازیں نادی مجرموں۔ ڈاکوؤں اور خونیوں کا ساتھ۔ زندگی کے سمندر میں موت کا یہ جزیرہ۔ انسانیت کی حدود سے باہر۔ دُنیا کے بیچ میں۔ مگر دنیا سے بہت دور۔ اور یہاں وجے سنگھ نے سولہ برس یعنی ایک سو بانوے مہینے تقریباً چھ ہزار مصیبت بھرے دن اور چھ ہزار کالی راتیں۔ اور اس کے بعد صرف بارہ گھنٹے زندگی کے۔ بارہ گھنٹے روشنی، رنگ اور خوشبو کے۔ اس کے بعد پھر جیل خانے کے مہیب کالے دروازے بند ہو جائیں گے۔

"میں سینما دیکھنا چاہتا ہوں۔ بولتا سینما" بچپن کی سادگی کے ساتھ وجے سنگھ نے کہا تھا۔ ہر انسان کی فطرت میں بچپن ہوتا ہے۔ اور انقلابی بھی تو آخر انسان ہے پھر کیا تعجب ہے، کہ آج کی رات اس کے دل میں سینما دیکھنے کی یہ شدید آرزو پیدا ہوگئی۔ کیا معلوم ہے اب جو وہ لیجائے تو پھر کبھی زندہ نہ نکلے۔ شاید سینما دیکھنے کی حسرت دل ہی دل میں رہ جائے

رام نگر میں ایک ہی معمولی سینما تھا۔ جہاں کئی سال کے پرانے ہندوستانی فلم دکھائے جاتے تھے۔ سینما تو وہاں ایک دفعہ بھی نہ گئی تھی۔ مگر وجے سنگھ کو لگی۔ تماشہ شروع ہونے ہی والا تھا۔ جب وہ ٹکٹ لے کر داخل ہوئے۔ روشنیاں گل ہو گئیں اور روپہلی پردے پر تصویروں نے حرکت شروع کر دی۔ فلم تھا "طوفان میل" پرانا نرطبل فلم۔ مگر وجے سنگھ کے لئے تو معجزے سے کم نہ تھی۔ تصویروں کو چلتے پھرتے تو اس نے ضرور قید ہونے سے پہلے دیکھا تھا۔

گر گاتے بولتے دیکھ کر وہ بالکل دنگ رہ گیا۔ چارلی اور غوری کے بھونڈے مذاق پر وہ بچوں کی طرح ہنسنے لگا۔ کھلکھلا کر تالیاں بجا کر۔ دوسرے تماشائی مڑ مڑ کر دیکھنے لگے۔ بینا کو پہلے تو ذرا کوفت ہوئی۔ مگر فوراً ہی اس کو خیال آیا کہ شائد سولہ برس میں پہلی بار وجے سنگھ ہنس رہا ہے۔ اور یہ خیال آتے ہی اس کو "طوفان میل" فلم بھی اچھا لگنے لگا۔

مادھوری اور ٹیمپوریا پردے پر محبت کا رنگین کھیل کھیل رہے تھے بیباک۔ بے پروا۔ جیوانی محبت۔ وہ محبت نہیں جو شب فراق کے آنسوؤں میں ظاہر ہوتی ہے۔ بلکہ وہ محبت جو قہقہوں اور معنی خیز نگاہوں میں جھلکتی ہے۔ مادھوری ایک حسینہ، بدن سے چپکے ہوئے لباس میں مجسم آرزو بنی ہوئی تھی شہوانیت کا ایک شرارہ جس کی قربت ہر ایک کو جھلس دینے کو کافی تھی۔ اُف رے اس کی شرارت آمیز، شہوت خیز باتیں۔ کٹیلی نظر۔ وہ اس کا سینہ کے ابھار پر ہاتھ رکھ کر ایک عجیب انداز سے کہنا "ہائے۔ یہاں"

وجے سنگھ بڑے انہماک سے فلم دیکھ رہا تھا۔ مگر اس کا ہاتھ — کیا بہ بھول سے بینا کے ہاتھ پر رکھا گیا تھا۔ چکی پیستے پیستے ہاتھ سخت ہو گیا۔ مگر پھر بھی اس میں ایک قسم کی نرمی تھی۔ کسی زمانے میں یہ ہاتھ نازک اور حساس رہا ہوگا۔ انگلیاں اب بھی لمبی اور نازک تھیں۔ وجے سنگھ تماشا دیکھ رہا تھا اور اس کا ہاتھ بینا کے ہاتھ پر رکھا تھا۔ وہ بینا کے ہاتھ کو دبانے کی کوشش نہیں کر رہا تھا۔ "شائد غلطی ہی سے یہ ہاتھ میرے ہاتھ پر رکھا گیا ہو۔" بینا نے سوچا اور نرمی سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔

ہال میں اندھیرا تھا۔ مگر پھر بھی بینا کو ایسا محسوس ہوا جیسے وجے سنگھ کو اس کا ہاتھ ہٹا لینا برا معلوم ہوا ہے۔ اس کے بعد فلم میں اس کی دلچسپی اور انہماک بھی ختم ہو گیا۔ تھوڑی دیر میں اس نے کہا "چلو گھر چلیں۔ بس دیکھ لیا فلم"۔ اور جب وہ باہر سڑک کی روشنی میں آئے تو وجے سنگھ ایک روٹھے ہوئے بچے کی طرح زمین پر نظریں جمائے چل رہا تھا۔

گھر پہنچ کر بینا نے اپنے پلنگ پر وجے سنگھ کے لئے بستر درست کر دیا۔ اور اس سے کہا کہ آرام سے سو جائے کیونکہ صبح ہی اس کو شہر جانا تھا اس کے بعد اس نے دوسرے کمرے میں فرش پر دری بچھا کر اپنے سونے کا انتظام کیا۔ ایک گلاس میں پانی بھر کر وجے سنگھ کے سرہانے رکھ دیا۔ اور پوچھا "اور کچھ چاہیئے؟" وجے سنگھ نے نفی میں سر ہلا دیا۔ مگر بینا نے بجلی کی روشنی میں دیکھا کہ اس کی آنکھیں اس کے چہرے پر گڑی ہوئی ہیں۔ اور ان آنکھوں کی گہرائی میں وہی جنون ان کی سطح پر وہی بچوں کی سی سادگی۔ اور ساتھ ہی وہ حیوانی کشش بھی ہے جو پارٹی کے دفتر والی تصویر میں تھی۔ بینا کے دیکھتے ہی دیکھتے۔ یہ آنکھیں دھندلا گئیں۔ اور ان میں آگ کے بجائے دھواں سا، تحکم کے بجائے التجا سی جھلکنے لگی۔ بینا نے جلدی سے روشنی بند کی اور اپنے کمرے میں چلی آئی۔

مگر دونوں کمروں کے درمیان جو دروازہ تھا۔ اس کی چٹخنی اس طرف لگتی تھی۔ جدھر وجے سنگھ کا پلنگ تھا۔ بینا نے کواڑ بھیڑتے ہوئے آواز دی "مہربانی کر کے چٹخنی لگا لیجئے گا"۔ یہ کہہ کر وہ اپنے بستر پر لیٹ گئی

اور انتظار کرتی رہی کہ چٹخنی بند کرنے کی آواز آئے۔ ایک منٹ گذرا۔ دو منٹ پانچ منٹ۔ دس منٹ اور بِنا کو ایسا محسوس ہوا کہ جب تک چٹخنی بند نہ ہو گی اسے نیند نہ آسکے گی۔ مگر چٹخنی بند نہ ہوئی۔

بِنا نے سوچا "کیا وجے سنگھ سو گیا ہے؟" مگر دوسرے کمرے سے پلنگ پہ کروٹیں بدلنے کی آواز آئی۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد ایسا معلوم ہوا جیسے وہ اٹھ بیٹھا ہو۔ پھر کمرے میں چلنے کی آواز۔ وہ سویا نہ تھا۔ ٹہل رہا تھا۔

بِنا کو وجے سنگھ کی بے چینی کی وجہ معلوم تھی۔ اس لئے کہ وہ خود اس بے چینی کی وجہ تھی۔ سولہ برس کی تنہائی اور بے لطف زندگی کے بعد "طوفان میل" کی بے باک محبت کے سبق دیکھ کر اس کے سوتے ہوئے جذبات جاگ اٹھے تھے۔ اور اپنی تسلی چاہتے تھے۔ کل صبح وہ پھر چل چلا جائیگا یہی چند گھنٹے باقی تھے

بِنا نے اب تک اپنے آپ کو جنسی لذتوں سے محروم رکھا تھا۔ کیا اسی لئے کہ ایک کریہہ المنظر، لمبی ڈاڑھی والے، گندے اور بیمار بڈھے کی ہوس کی آگ بجھائے؟ اس نے ہمیشہ ایک خوبصورت، تندرست نوجوان کے خواب دیکھے تھے۔ نوجوان جو اس سے محبت کرتا ہو۔ اس کے ساتھ اپنا تمام جیون بتانے کو تیار ہو۔ کہاں اس کے سپنوں کا وہ گبرو جوان اور کہاں یہ مرجھایا ہوا بڈھا! نہیں ہرگز نہیں۔ وہ ہرگز ایسا نہیں کر سکتی۔

مگر بِنا کے حساس مگر ہمدرد دماغ نے اسی صورت حال کو دوسری

طرح یوں پیش کیا۔ " بے شک وجے سنگھ قبل از وقت بڈھا ہو چکا ہے۔ اس کے
چہرے پر خوفناک ڈاڑھی ہے۔ اس کی پیشانی پر جھریاں پڑی ہیں۔ اس کے
سر پر پھنسیاں نکلی ہیں۔ اس کے منہ سے زرد اور گندے دانت جھانک رہے
ہیں۔ مگر کیوں ؟ بینا، سوچ۔ سولہ برس ہوئے یہی وجے سنگھ ایک خوبصورت
کڑیل جوان تھا۔ تو نے اس کی تصویر دیکھی ہے۔ کیا تو نے اس تصویر کی طرف
تمنا بھری نظروں سے نہیں دیکھا ؟ آج اسی وجے سنگھ کی یہ حالت کیوں ہے؟
کیوں ؟ سولہ برس میں چھتیس برس کا نوجوان اتنا بڈھا نہیں ہو سکتا۔
وجے سنگھ کیوں اپنی جوانی، اپنا حسن، اپنی تندرستی کھو بیٹھا؟ انقلاب
کے لئے۔ بینا، انقلاب کے لئے۔ اسی انقلاب کے بھیانک کی خاطر تو جان
دینے کو تیار ہے۔ مگر تو تو باتیں ہی بناتی ہے۔ اس نے تو کر دکھایا۔
اپنا جوانی، اپنی تندرستی، اپنے دوست اور عزیز، اپنے رومان بھرے
خواب۔ سب کچھ انقلاب کے لئے قربان کر دیئے۔ سولہ برس جیل میں کالے
کال کوٹھڑی میں رہا۔ کوڑوں کی مار کھائی وارڈروں کی ٹھوکریں
گالیاں سنیں۔ کس لئے ؟ انقلاب کے لئے۔ اور تو [illegible]
ہے کہ آج تو اس وجے سنگھ کی ڈاڑھی، اس کی جھریوں، اس کی پھنسیوں
کو نفرت کی نظر سے دیکھتی ہے۔ لعنت ہے تجھ پر! "

دوسرے کمرے میں وجے سنگھ اب بھی ٹہل رہا تھا۔ قدم چلتے چلتے
دروازے کے قریب آئے اور رک گئے۔ بینا کا دل بھی حرکت کرتے
کرتے رک گیا ...... نہ چٹخنی بند کرنے کی آواز آئی نہ دروازہ کھلا۔ چند

سیکنڈ کے بعد قدم واپس چلے گئے۔ بینا کا دل پھر حرکت کرنے لگا۔

"نہیں وہ اپنی طرف سے پہل نہیں کرے گا۔ وہ حساس ہے۔ اس کو اپنی بدصورتی کا علم ہے۔ وہ مجھے چھیڑنے کی ہمت نہ کرے گا۔ اگر تو اس کمرے میں نہیں جائے گی تو وہ رات جہنم کر گذار دے گا۔ اور صبح کو ایک لفظ کہے بغیر چپ چاپ چلا جائے گا جس نے سولہ برس یوں گذار دیئے وہ تو باقی زندگی بھی گذار سکتا ہے۔ مگر تو نے اس کو مایوس لوٹ جانے دیا تو اپنے آپ کو تو کبھی معاف نہ کر سکے گی۔ اس کی حسرت اور آرزو بھری نگاہیں ہمیشہ تیرا پیچھا کرتی رہیں گی"

وجے سنگھ کے قدم چلتے چلتے رک گئے۔ پلنگ پر بیٹھنے کی آواز آئی۔ پھر لیٹنے کی۔

"شاید سو جائے" بینا نے اپنے آپ کو سمجھانے کی کوشش کی مگر فوراً ہی کروٹیں بدلنے کی آواز آئی۔ اور یہ کیا؟ کیا بینا کے کان دھوکا دے رہے تھے۔ یا واقعی وجے سنگھ رو رہا تھا؟ بینا گھبرا کر اٹھ بیٹھی — وجے سنگھ رو رہا ہے! وجے سنگھ جس کے متعلق مشہور ہے کہ جب اسے کوڑے مارے گئے تو وہ ہنس رہا تھا۔ وجے سنگھ جو پھانسی کا حکم پاکر بھی مسکرایا تھا۔ وہی وجے سنگھ جس نے پچاس دن بھوک ہڑتال کی تھی۔ جو نہ تشدد سے ڈرتا تھا نہ مار سے۔ جو موت سے گھبراتا تھا نہ کالے پانی کی سزا سے وہی وجے سنگھ آج رو رہا ہے۔ بچوں کی طرح سسکیاں لے لے کر۔

وجے سنگھ کی سسکیں بینا کے شہوانی جذبات کو بیدار نہ کر سکی تھیں۔

اس نے بینا کے ہاتھ کو چھوا تھا۔ مگر یہ پیغام بے کار ثابت ہوا تھا لیکن اس کو رونا دیکھ کر بینا کی ممتا جاگ اٹھی۔ بچوں کی ہر ضد پوری کرنی چاہیئے۔ اور ہندوستان کا سب سے بڑا انقلابی، نڈر وجے سنگھ بھی اس معاملے میں بچہ ہی تو تھا۔ باوجود اپنی داڑھی، اپنی پھنسیوں اور میلے میلے زرد دانتوں کے۔

بینا کے دل کی تہ میں سے رواجی اخلاقیات نے سر اٹھایا اور اسں کو سمجھانے کی کوشش کی۔ "عصمت عورت کا بہترین زیور ہے۔ کیا تو اسں کو یوں لٹا دے گی؟" اور جب یوں بھی نہ مانی تو اس کو ڈرانے کی کوشش کی۔ "وہ بیمار ہے۔ اس کے پھنسیاں نکلی ہوئی ہیں۔ تجھے کوئی بیماری لگ جائے گی؟"

مگر بینا اس وقت ان خوفناک سولہ برسوں کا خیال کر رہی تھی جو وجے سنگھ نے قید میں گذارے تھے۔ وہ طویل عرصہ جس میں وہ زندگی کی ہر دلچسپ اور خوشگوار رنگینی سے محروم رہا تھا۔ سینما اور تھیٹر۔ گانا اور ناچ۔ بچوں کی آواز غروب آفتاب کا رنگین منظر۔ چاند اور ستارے۔ برسات کی رم جھم اور گیلی مٹی کی خوشبو۔ درختوں کی چھاؤں۔ پھولوں کی بہار۔ ماں کی ممتا۔ اولاد کی امنگ۔ عورت کا پیار۔ اور کل پھر وہ اسی دوزخ میں جھونک دیا جائے گا۔ اور یہ زندگی کے بارہ گھنٹے یوں ہی گذر جائیں گے۔ وجے سنگھ اپنی پیاس کو ساتھ لئے واپس چلا جائے گا۔ وہ جس نے اپنی جان قوم کی آزادی اور انقلاب کے لئے قربان کر دی تھی۔ اس کے واسطے ایک عورت چند گھنٹے کے لئے اپنا جسم بھی دینے کو تیار نہ ہو گی۔ عورت

نرمی ۔ پیار ۔ دل کے قریب ایک اور دھڑکن ۔ سولہ برس تک وہ اُن سے محروم رہا ۔ اس وقت اس کو اگر یہ نصیب نہ ہوا تو شائد مرتے دم تک نصیب نہ ہو۔ نہیں وہ ایسا نہ ہونے دے گی ۔ اس نے اپنی جان انقلاب کیلئے وقف کر دی تھی ۔ اپنی جان ۔ اور اپنا جسم ۔ اپنی عصمت بھی ۔ وجے سنگھ کی قربانیوں کے سامنے اس کے حقیر جسم کی کیا وقعت تھی ۔ اس سے بہتر جسم بازار میں پانچ پانچ روپے فروخت ہوتے ہیں ۔ نہیں ۔ وہ اپنی محبت سے ، اپنے بدن کی گرمی سے وجے سنگھ کو آرام پہنچائے گی ۔ چند گھنٹے میں سولہ برس کی محرومیوں کا ازالہ کرنے کی کوشش کرے گی ۔ اس کے بدن میں وجے سنگھ کو چند لمحے کے لئے ہی سہی ، پھولوں کی بہار بچوں کی آواز ، ماں کی ممتا ۔ موسیقی کی جھنکار ، غروب آفتاب کی رنگینی ۔ برسات کی رِم جھم ۔ سب کچھ مل جائے گا ۔ اور آئندہ زمانے میں جب وہ جیل کی سختیوں سے تنگ آکر دُنیا اور زندگی کی طرف سے مایوس ہونے لگے گا تو اسے ان چند گھنٹوں کی یاد آئیگی ایک لڑکی کی یاد ۔ ایک نوجوان جسم کی یاد ۔ اور وہ مسکرا دے گا ۔ مایوسی کے بادل چھٹ جائیں گے ۔ وہ زندگی سے مُنہ موڑتے موڑتے رک جائے گا وہ اپنے جسم اور دماغ اور دل کو زندہ رکھے گا ۔ ہندوستان کی خاطر ۔ انقلاب کی خاطر ۔ اور پھر جب ملک آزاد ہو جائے گا تو وجے مایوس اور شکستہ خاطر نہیں بلکہ مسکراتا ہوا قید خانے سے نکلے گا تاکہ پھر اپنی قوم اور اپنے ملک کی خدمت کر سکے ۔ لاکھوں اس کی کہانی سنیں گے اور اس کی قربانی اور ایثار سے ان کے سر بلند ہو جائیں گے اور دل فخر سے بھر جائیں گے ۔

اس وقت شاید جے سنگھ بینا کا نام بھی بھول جائے گا۔ انقلابی حکومت کو چلانے کے کام میں اس کو ایک گمنام لڑکی کو یاد کرنے کی کب فرصت ہوگی مگر اس وقت بینا کو وہ حساس فتح نصیب ہوگا جو ایک آرٹسٹ کو اپنا شاہکار دیکھ کر نصیب ہوتا ہے۔

بینا اٹھی، دروازہ کھولا اور دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

ایک پائلی چاول

ناگنوں کی طرح بل کھاتی، چیونٹی کی رفتار سے رینگتی، شہد کی مکھیوں کے چھتے کی طرح بھنبھناتی، دو لمبی قطاریں ——— ایک مردوں کی اور ایک عورتوں کی ——— سرکاری اناج کی دکان کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ عورتوں کی قطار مردوں کی قطار سے بھی زیادہ لمبی۔ کوئی ایک فرلانگ لمبی۔ اس کا آخری سرا سڑک کے نکڑ پر سے مڑتا ہوا ایک تنگ سی گلی میں پہنچا ہوا تھا۔ دیر میں آنے والی عورتیں ایک کے پیچھے ایک کھڑی ہوتی جا رہی تھیں۔ ان کو تو اناج کی دوکان کی دور سے جھلک بھی نظر نہیں آتی تھی۔ بس کچھ نظر آتا تھا تو اپنے

سے اگلی عورت کا سر۔
کئی سو عورتیں۔ ہندو مسلمان۔ عیسائی۔ پارسی۔ یہودی۔ مسلمان عورتیں برقعہ اوڑھے ہوئے اور بغیر برقعہ کے۔ کالے چکنے جسم والی مچھی والیاں جن کے بالوں کے پھولوں کی خوشبو ان کے کپڑوں کی مچھلی کی بو میں مل کر ہوا میں پھیل رہی تھی۔ فراک پہنے ہوئے ننگی ٹانگوں، پاؤں میں چپل غریب دیسی عیسائی گوا کی عورتیں۔ گھٹیا قسم کے پینٹ اور پاوڈر اور سینٹ میں بسائی ہوئی۔ نقلی سلک کی جرابیں اور اونچی ایڑی کے جوتے پہنے اینگلو انڈین لڑکیاں۔ پھولدار ریشمی شالیں کاندھوں پر ڈالے گوری چٹی کالے بالوں والی یہودنیں۔ سڈول جسم کی مرہٹنیں اور بہت دبلی یا بہت موٹی گجراتنیں۔ کلرکوں کی بیویاں۔ مزدوروں کی بیویاں۔ معمولی درجے کے دکانداروں کی بیویاں۔ ٹیکسی ڈرائیوروں کی بیویاں۔ شادی شدہ بیویاں۔ غیر شادی شدہ بیویاں۔ موتیا کی کلیاں اور مرجھائے ہوئے پھول۔ سینٹ اور پسینہ مچھلی کی بو اور ناریل کے تیل کی بو۔ اور دوپہر کی دھوپ میں ان مختلف خوشبوؤں اور بدبوؤں کے ملے ہوئے ابخرات اوپر کو اٹھتے ہوئے۔ مرہٹی اور گجراتی اور ہندوستانی اور انگریزی زبانوں میں گفتگو کا ایک ناقابل فہم شور۔ کئی لاکھ بھنبھناہٹ۔ انتظار۔ ساٹھ سکنڈوں کا ایک منٹ۔ اور ساٹھ منٹوں کا ایک گھنٹہ۔ ایک گھنٹہ۔ دو گھنٹے۔ تین گھنٹے اور ناگن کی طرح بل کھاتی، چیونٹیوں کی رفتار سے رینگتی عورتوں کی یہ لمبی قطار لحظہ بہ لحظہ بڑھتی ہوئی۔ جتنی دیر میں اگلے سرے پر ایک عورت اناج لے کر رخصت ہوتی تھی دو نئی عورتیں

پیچھے اکر شامل ہو جاتی تھیں۔ دو سو عورتیں۔ ڈھائی سو عورتیں۔ تین سو عورتیں۔ ساڑھے تین سو عورتیں۔ کتنے صبر کے ساتھ صبح سے انتظار کر رہی تھیں۔ ایک ٹانگ تھک جاتی تو دوسری کے سہارے کھڑی ہو جاتی تھیں۔ صبر اور خلوص اور عقیدت کا ایک عجیب مظاہرہ۔ جیسے پجارنیں مندر کے دروازے کھلنے کا انتظار کر رہی ہوں۔ ایک نیا شوالہ۔ جہاں ہندو اور مسلمان، پارسنیں اور یہودنیں سب پوجا کے لئے آئی تھیں۔ ہر ایک کے ہاتھ میں ایک تھیلا۔ ہر ایک کے دماغ میں بس ایک خیال۔ ایک آرزو۔ ایک ہوس۔ ایک پائیلی[1] چاول!

درگا آئی اور عورتوں کی قطار کے آخری سرے پر سب سے پیچھے کھڑی ہو گئی۔ اس کو آج یہاں آنے میں دیر ہو گئی تھی۔ صبح سے اُس کے سر میں، جسم میں، پیٹ میں بڑا شدید درد ہو رہا تھا۔ اس کی حالت ایسی نہ تھی کہ وہ آج یہاں گھنٹوں کے لئے آکر کھڑی ہوتی مگر مجبور تھی۔ گھر میں چاول کے آخری چند دانے بھی ختم ہو چکے تھے۔ دو وقت بازار کا کھانا کھایا۔ آج کئی دن کے بعد دکان کھلی تھی اگر اس نے چاول نہ خریدے تو معلوم نہیں پھر کب تک گھر کا کھانا نصیب نہ ہو۔ اور اس عرصے میں اگر کہیں دن پورے ہو گئے اور وہ وقت آگیا جس کا انتظار رہتا تو پھر تو اور بھی مشکل ہو جائیگی۔

دُرگا کا شوہر ایک کارخانے میں کام کرتا تھا۔ صبح کو گھر سے نکلتا تو کبھی چراغ جلے واپس آتا۔ وہ بھی دن بھر مشین کی طرح کام کرنیکے بعد تھکا ماندہ

---

[1] "پائیلی" اناج کا ایک پیمانہ جو بمبئی میں استعمال کیا ہے۔ اس سے حجم کے مطابق اناج ناپا جاتا ہے۔ ایک پائیلی چاول تقریباً ساڑھے تین سیر ہوتے ہیں!

بازار کا سب سودا سلف درگاہی کو لانا پڑتا تھا۔ وہ مزدوری پیشہ عورت تھی۔ اس کو کام کرنے میں نہ عار تھا اور نہ کوئی دقت۔ وہ جب تک اپنے ماں باپ کے پاس گاؤں میں رہی تھی کھیتی کے کام میں ہاتھ بٹایا کرتی تھی، چرخہ کاتتی، چکی چلاتی۔ اپنے باپ بھائی کے لئے روٹی پکاکر کھیت پرلے جاتی۔ گائے بیلوں کے لئے کٹی کاٹتی۔ دودھ دوہتی اور رات کو سونے سے پہلے ان کے پاؤں ملاکر باندھتی ...... بیاہ کے بعد جب شہر آئی تھی اپنے نندو کی طرح وہ بھی کارخانے میں کام کرتی تھی۔ دس گھنٹے روزانہ وہاں کام کرتی، پھر گھر آکر چولھا پھونکتی۔ مگر اس کو کبھی یہ خیال نہ گذرا تھا کہ وہ بہت محنت کرتی ہے۔ اپنے نندو کی خاطر وہ سب کچھ کرنے کو تیار تھی۔ اس کا نندو کتنا اچھا تھا۔ اس نے بمبئی لاکر درگا کو کتنی سیریں کرائی تھیں۔ چڑیا گھر، جوہو پاٹی، اپالو بندر۔ کئی دفعہ سینما لے گیا۔ ایسی چیزیں درگا نے اپنے گاؤں میں کاہے کو دیکھی تھیں۔ نندو اس کا بہت خیال رکھتا تھا۔ اور مزدوروں کی طرح وہ نہ شراب پی کر آتا تھا نہ اپنی بیوی کو پیٹتا تھا۔ اور ابھی چھٹا مہینہ پورا نہیں ہوا تھا کہ اس نے درگا کا کارخانے جانا بند کر دیا۔

"اب تجھے گھر میں آرام کرنا چاہئے۔ اب تو میرے لونڈے کی ماں بننے والی ہے نا؟" نندو نے ہنس کر کہا تھا "دیکھ! درگا لونڈا لے اول گا۔ لونڈیا نہیں چاہئے"

ناگن کی طرح بل کھاتی، چیونٹی کی رفتار سے رینگتی، عورتوں کی لمبی قطار اناج کی دکان کی طرف بڑھتی جا رہی تھی۔ اب درگا کے پیچھے بھی آٹھ

دس عورتیں قطار میں آ ملی تھیں۔ کہیں کہیں آپس میں بحث و مباحثے ہو رہے تھے۔ ایک پارسن بازار کی بڑھتی ہوئی قیمتوں پر مبسوط تبصرہ کر رہی تھی۔ ایک خوجن اناج کی کمی کا الزام کانگریس کے سر رکھ رہی تھی۔ ایک عیسائی عورت کا خیال تھا کہ یہ سب مہاتما گاندھی کا قصور ہے۔ نہ وہ سرکار سے لڑائی مول لیتے نہ سرکار ہندوستانیوں کو سزا دینے کے لئے اناج پر پابندیاں لگاتی۔

"کانگریس اور مہاتما گاندھی کو کیوں دوش دیتی ہو۔ معلوم نہیں ہے کہ گورنمنٹ نے لاکھوں من گیہوں ایران اور عراق اور مصر بھیج دیا ہے" ایک گجراتن بولی۔

"ہاں گورنمنٹ نے اناج باہر بھی بھیج دیا ہے" ایک مرہٹن چمک کر بولی "مگر ہم ہندوستانی کب بے قصور ہیں۔ بنیوں اور آڑھتیوں نے اپنے گھروں میں کچھ کم اناج بھر رکھا ہے"

"اور کیا! ہم ایک پائلی چاول کے لئے پانچ پانچ اور چھ چھ گھنٹے دھوپ میں کھڑے رہتے ہیں اور یہ بنئے ہیں کہ ہر ایک نے ہزاروں من اناج چھپا کر رکھا ہے اور چوری سے دگنی تگنی قیمتوں پر بیچ رہے ہیں"

"ایسے لوگوں کو پھانسی دیدینی چاہئے"

"وہ دوسرے ملکوں میں ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں تو ان کو رائے بہادر خان بہادر کے خطاب ملتے ہیں، جنگی کاموں کے ٹھیکے دئیے جاتے ہیں، یہ ہندوستان ہے"

دوسری طرف جنگ کی خبروں پر تنقید ہو رہی تھی۔

"ارے تمھیں نہیں معلوم۔ یہ جرمن اور جاپان ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں۔ جاپان کو موقع مل گیا تو روس پر حملہ کرنے سے باز نہ آئے گا۔"

"ابھی تو ہاں ہو کہ اس کی شامت ہی آگئی۔ یہ برما اور فلپائن نہیں ہیں جنہیں کہ ہڑپ کر گیا اور ڈکار تک نہ لی یہ" روس ہے روس"۔ یہ کسی اخبار نویس کی بیوی تھی جس کا شوہر شاید خواب میں بھی خبروں کی سرخیاں پڑھتا رہتا تھا

روس! دھوپ میں درگا کا سر چکرا رہا تھا مگر اس نے سوچا یہ لفظ "روس" میں نے کہیں سنا ہے۔ اور نہ جانے کیوں اس کو ایسا معلوم ہوا جیسے اس "روس" اور اس کی اپنی زندگی میں کوئی بڑا گہرا تعلق ہے۔ ہاں! اب یاد آیا۔ نندو اسے ایک دفعہ ایک جلسہ میں لے گیا تھا۔ مزدوروں کا جلسہ تھا۔ کوئی بیس تیس ہزار مزدور رہوں گے۔ کئی ہزار تو عورتیں ہی تھیں ہر طرف لال لال جھنڈے۔ ان جھنڈوں پر ہتھوڑے اور درانتی کا نشان۔ بیچ میں ایک اونچا سا چبوترہ جس پر کھڑے ہو کر لوگ تقریر کر رہے تھے۔ اور درگا یہ دیکھ کر دنگ رہ گئی کہ تقریر تو اتنی دور چبوترے پر ہو رہی ہے مگر آواز اس کے قریب ہی ایک کھمبے پر لگے ہوئے کالے بھونپو میں سے آرہی ہے عجیب سی آواز جیسے کوئی کنوئیں میں منہ کر کے بول رہا ہو۔ اور یہ آواز کہہ رہی تھی۔

"بھائیو ہٹلر کے خونی لٹیروں نے روس پر حملہ کر دیا ہے۔ روس جو مزدوروں کا اپنا ملک ہے۔ روس جہاں مزدوروں کا اپنا راج ہے ...... دنیا کے مزدوروں کو چاہئیے کہ وہ روس کی مدد کے لئے کھڑے ہو جائیں ..... اور پھر "سوویت روس زندہ باد" کے نعرے ہزاروں گلوں سے اس طرح نکلے کہ

معلوم ہوتا تھا آسمان پھٹ پڑے گا۔

کتنی دیر ہوگئی تھی اس کو کھڑے کھڑے! درگا نے مڑ کر دیکھا کوئی سولہ سترہ عورتیں اس کے پیچھے تھیں اب وہ قطار کے ساتھ بڑھتے بڑھتے سڑک کے کنارے پر آگئی تھی۔ گردن ٹیڑھی کر کے وہ اناج کی دکان کا لال لال سائن بورڈ بھی دیکھ سکتی تھی۔ مگر اب بھی کم سے کم سو عورتیں اس کے اور ایک پانسیلی جانے کے درمیان حائل تھیں۔ معلوم نہیں کیوں یہ دکاندار اتنی دیر لگاتا ہے! درگا نے ایک تھکی ہوئی ٹانگ سے دوسری تھکی ہوئی ٹانگ پر بوجھ بدلتے ہوئے سوچا۔ اور عورتیں بھی بولتے بولتے تھک گئی تھیں اور گرمی اور خاموشی نے سب کو اپنے پنجے میں دبوچ رکھا تھا۔ نیلی وردی پہنے ایک پولیس کا سپاہی سامنے درخت کے نیچے اونگھ رہا تھا۔ اس کو اونگھتے دیکھ کر درگا کی تمام تھکن اس کی ٹانگوں کا درد، پیٹ کی چبھن سب اس کی آنکھوں میں سمٹ آئی۔ اس کا جی چاہا وہیں گرم زمین پر سر رکھ کر لیٹ جائے۔ اس کے قدم ڈگمگائے تو اس نے اپنے سے اگلی عورت کے کندھے کا سہارا لے لیا۔

"ارے میری بہن۔ ذرا اپنے ہی سہارے سے کھڑی رہو!" کوئی بڑھیا عورت تھی۔ اس کی آواز میں کوئی غصہ یا جلن نہیں تھی مگر درگا شرمندہ ہو کر پھر گئی۔ بے خیال پیچھے ہٹی تو اس دفعہ سخت ڈانٹ پڑی "...... اندھی ہو میرا پاؤں کچل دیا" اور یہ عورت جب درگا سے بچنے کے لیے اتنا پیچھے ہٹی تو قطار کے اخیر تک گالیوں اور کوسنوں کا مختلف زبانوں میں شور بلند ہوتا گیا۔

درگا شرمندگی سے پانی پانی ہوگئی۔ اس نے دانت کچکچا کر اپنے بدن کو قابو میں کیا اور زمین میں نظریں گڑا دیں۔ ایک دفعہ اس کا جی چاہا کہ ایک پائیلی چاول کی امید چھوڑ کر گھر بھاگ جائے۔ مگر پھر سوچا کہ نند و شام کو تھکا ہارا آئے گا تو کیا کھائے گا۔ اس کا اچھا بھلا نند و جو اس کی خاطر آج کل کئی کئی گھنٹے "روزانہ" اور "اوور ٹائم" کام کرتا ہے۔ اور اب تو وہ دکان کے قریب ہی آگئی تھی۔ اگر کسی نہ کسی طرح ایک آدھ گھنٹہ اور گزر جائے تو پھر وہ چاول لے کر ہی گھر جائے گی۔

مگر یہ پیٹ میں اتنا درد کیوں ہو رہا ہے؟ جیسے کوئی آری چلا رہا ہو درگا تکلیف کے مارے پسینوں میں نہا رہی تھی۔ اس کا سر پھر چکرا رہا تھا۔ اور پیٹ کے اندر درد کی لہریں اٹھ رہی تھیں۔ کرب و اذیت کا جوار بھاٹا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی دشمن بھالا لئے بار بار حملہ کر رہا ہے۔ ایک وار کا زخم نہیں بھرتا کہ دوسرا وار کرتا ہے۔ کیا دن پورے ہوگئے ہیں؟ کیا وہ وقت آگیا ہے۔ جس کا وہ اتنے دنوں سے انتظار کر رہی تھی؟ نہیں یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ ابھی تین ہی دن تو ہوئے دائی نے کہا تھا کہ دس پندرہ دن اور لگیں گے۔ شاید یہ کوئی اور قسم کا درد ہے! درد اور تکلیف کے اس طوفان میں درگا نہ جانے کس طرح پوری قطار کے ساتھ آپ سے آپ دکان کے دروازے تک پہنچ گئی۔ اب صرف ایک عورت اس کے سامنے تھی۔ جب یہ عورت بھی دکان کے اندر چلی گئی تو درگا نے دیکھا کہ اس کو بھی سیڑھی پر چڑھ کر جانا ہوگا۔ ایک ایک فٹ کی یہ دو سیڑھیاں اس کو ایسی معلوم ہوئیں جیسے اس کے

گاؤں کا مندر والا ٹیلہ جس کی چوٹی پر جانے کے لئے سو سے زیادہ سیڑھیوں پر چڑھنا پڑتا تھا۔ بے بھگوان۔ وہ اس ڈگمگاتی ہوئی لکڑی کی سیڑھی پر چڑھ کر دکان کے اندر کیسے جا سکے گی۔

اس سے اگلی عورت تھیلے میں ایک پائیلی چاول لئے مسکراتی پسینہ پونچھتی دکان سے باہر نکل آئی درگا کے پیچھے والی عورت نے اس کا ٹھوکا دیا "چل با با چل۔ کیا سو رہی ہے" بنئے نے بھی درگا کی طرف دیکھا اور کہا۔ "آ۔ بائی۔ کیوں دیر لگا رکھی ہے؟" مگر اس نے یہ تو دیکھا کہ درگا کی رنگت پیلی پڑتی جا رہی تھی۔ اس کی ٹانگیں سیڑھی پر چڑھنے کے خیال سے ہی ڈگمگا رہی تھیں۔

"مجھ سے ..... مجھ سے ..... مجھے یہیں دیدو، بھائی؟" اس کے ہونٹ ہو کھے ہوئے تھے۔ آواز بھی مشکل سے نکلی۔

"تم میں کون سے سرخاب کے پر لگے ہیں۔ لینا ہے تو اندر آ کر لو۔" "چلتی کیوں نہیں آخر؟"

"نہیں لینا ہے تو رستہ چھوڑ دو۔ دوسروں کو جگہ دو۔"

ہر قدم پر درگا یہی سمجھتی رہی کہ وہ چکرا کر گر پڑے گی۔ مگر کسی نہ کسی طرح اس نے اپنے جسم کو گھسیٹ کر دکان کے اندر پہنچا دیا۔ کانپتے ہوئے ہاتھوں سے تھیلا بنئے کی طرف بڑھا کر اس نے دام سامنے رکھ دئے جو چار گھنٹے سے وہ اپنی مٹھی میں لئے ہوئے تھی اور جو پسینے سے گیلے ہو رہے دکاندار نے پائیلی کا پیمانہ اٹھایا، اس کو چاول سے بھر کر درگا کے تھیلے

میں ڈال دیا پھر درگا نے دیکھا کہ وہ موٹا بنیا آپ سے آپ گھوم رہا ہے۔ پائیلی کا برتن بھی۔ چاولوں کا تھیلا بھی۔ پوری دکان گھوم رہی ہے۔ اور گھومتے گھومتے یہ پوری دکان ـــــ اناج کی بوریاں، گھی کے پیپے، دیوار پر لٹکی ہوئی ہنومان کی تصویر ـــــ درگا سے ٹکرائی اور اس کے منہ سے ایک چیخ نکل گئی۔

اس نے دیکھا کہ وہ چاولوں کے ایک ڈھیر کے نیچے دبی پڑی ہے اس کا سانس گھٹا جا رہا ہے۔ مگر اس کے اوپر سے چاول آپ سے آپ ہٹتے گئے۔ ہنومان جی ان چاولوں کو پائیلی کے برتن میں بھر بھر کر سب عورتوں کو بانٹ رہے ہیں۔ "یہ لو ایک پائیلی چاول۔ یہ لو ایک پائیلی چاول!" اور ہنومان جی کی دم خوشی سے ناچ رہی ہے۔ مگر نہیں یہ تو دُم نہیں ایک ناگن ہے۔ اور اس کا منہ اس عورت کی طرح سے ہے جس نے درگا کو گالی دی تھی۔ اور دم بھر میں یہ ناگن چولتی گئی، بڑھتی گئی اور دکان سے لے کر بل کھاتی ہوئی نکڑ والی گلی تک جا پہنچی۔ پھنکاریں مارتی ہوئی اب وہ درگا کی طرف بڑھتی ہوئی آ رہی تھی۔ کوئی دم میں اس کو ہڑپ کر جائے گی۔ ناگن نے اوپر کا سانس لیا اور درگا کھنچی ہوئی اس کے پیٹ میں چلی گئی۔۔۔۔۔۔۔

مگر نہیں یہ ناگن کا پیٹ نہیں تھا بلکہ ایک اندھیرا کمرہ تھا۔ اندھیرا، گرمی، ہوا بند۔ درگا کا دم گھٹنے لگا۔ اندھیرے کی تہہ میں سے کسی کی آواز آئی "یہ ہندوستان ہے ہندوستان"! اور پھر اندھیرے میں دور سے دو لال لال شعلے چمکنے لگیں۔ درگا سمجھی یہ کسی ناگن کی آنکھیں چمک رہی ہیں۔ مگر قریب آئیں تو اس نے دیکھا کہ یہ تو لال جھنڈے ہیں اور ان پر ہنوڑے اور درانتی کا نشان! آپ سے

آپ ہوا میں اڑے جا رہے تھے۔ اب چاروں طرف روشنی ہو گئی۔ ہزاروں لاکھوں مزدور کچھ عجیب زبان میں گاتے ہوئے چلے جا رہے تھے۔ ایک کنویں کے اندر سے آواز آئی۔ "یہ روس ہے روس" اور پھر دفعتاً بادل چھا گئے اور بجلی چمکنے لگی۔ دور سے بادلوں کے گرجنے کی آواز آئی۔ نہیں یہ بادل نہیں گرج رہے تھے بلکہ توپیں چل رہی تھیں۔ بم برس رہے تھے۔ جیسے اس نے سینما میں دیکھے تھے۔ ایک بم بالکل درگا کے قریب آ کر گرا اور اس کے ٹکڑے ٹکڑے ہو کر ہوا میں اڑ گئے.........

اور اب اس کو ایسا معلوم ہوا کہ وہ ننگی پڑی ہے۔ ننگی۔ مادر زاد ننگی۔ درگا شرم کے مارے گڑ گئی۔ مگر وہ اٹھنے نہ پائی تھی کہ ایک ہیبت ناک دیو آیا اور ایک بہت بڑے آرے سے اس کا پیٹ کاٹنے لگا۔ مگر جب اس کو قریب سے دیکھا تو درگا کی حیرت کی انتہا نہ رہی کیونکہ وہ خود اس کا شوہر نند و تھا۔ خوشی خوشی وہ اس کا پیٹ کاٹ رہا تھا اور کہتا جاتا تھا کہ "لونڈا لوں گا لونڈا۔ مجھے لونڈیا نہیں چاہئے"۔ "یہ ہندوستان ہے ہندوستان" تو اس پر وہ موٹی گجراتن بولی "گاندھی جی کو کیوں دوش دیتی ہے۔ ان کو تو خود انگریز تنگ کیا کرتے ہیں".........

سب لوگ غائب ہو گئے۔ اب درگا نے دیکھا کہ وہ موٹی ہو گئی ہے۔ اس بنئے سے بھی زیادہ موٹی۔ اور اس کی توند نکل آئی ہے ایک مٹکے کے برابر۔ اور پھر کسی نے اس کی توند میں ایک سوا گھپا دیا اور اس میں سے خون نکلنے لگا۔ اتنا نکلا کہ اس کے تمام کپڑے اور جسم خون میں

لت پت ہو گیا اور اس کا پیٹ پچک کر کمر کو لگ گیا۔ کہیں دور کوئی درگا کے دماغ کے دروازے کو کھٹکھٹا رہا تھا۔ کچھ لوگ باتیں کر رہے تھے۔ اور بیہوشی کے بادلوں میں سے دکان گھومتی گھومتی نکل رہی تھی۔ گھومتے گھومتے ...... آہستہ آہستہ دکان ٹھیر گئی۔ سامنے ہنومان جی کی تصویر بدستور لٹکی ہوئی تھی۔

کمزوری کی وجہ سے درگا گردن بھی نہ موڑ سکتی تھی۔ مگر اس کو ایسا محسوس ہوا۔ جیسے دکان آدمیوں سے بھری ہوئی ہو۔ آوازیں بدستور آ رہی تھیں مگر کوئی کوئی لفظ ہی سمجھ میں آتا تھا۔

"...... بیچاری ...... شاید پہلا ہی ہے ......"

"کسی مزدور کی ...... معلوم نہیں کہاں ہوگا ......"

"چلو ہٹو ...... تماشہ ...... نکلو"

درگا نے اپنے پیٹ میں ایک عجیب خلا محسوس کیا۔ ہاتھ ہلانے کی کوشش کی تو ایسا معلوم ہوا گویا تمام کپڑے پانی ...... نہیں خون ...... میں لت پت ہیں۔ اور دفعتاً اس کے دماغ میں ایک ہولناک خیال بجلی کی طرح کوند گیا۔

"میں نے یہاں ...... تمام دنیا کے سامنے بچہ جنا ہے! ہے بھگوان کیا یہ بے شرمی میرے ہی بھاگ میں لکھی تھی؟" اس کا بس چلتا تو وہیں زمین میں گڑ جاتی۔ ایسی بے عزتی سے تو موت ہی بہتر تھی کمزوری کی ایک لہر آئی اور درگا نے آنکھیں بند کر لیں۔ اس نے سوچا

اب میں کس طرح یہاں سے جاؤں گی؟ کیسے کسی کو منہ دکھاؤں گی؟ ساری دنیا میری طرف اشارہ کرے گی۔"

کئی منٹ درگا اسی شرمندگی کے سمندر میں غرق رہی۔ کمزوری اور بے ہوشی کا پھر غلبہ ہونے والا تھا کہ ......

"قیں۔ ایں۔ ایں۔ ایں ......"

ایک بچے کے رونے کی آواز آئی۔ ایک بچہ۔ اس کا بچہ۔ درگا کا بچہ۔ ہندو کا بچہ۔

اور اس ننھی سی آواز نے سماج کی بنائی ہوئی شرم اور نفاست کی دیواروں کو لرزا دیا۔ درگا کے داغ پر سے کمزوری اور بیہوشی کے بادل چھٹ گئے۔ اس نے تکلیف کی پرواہ نہ کرتے ہوئے گردن موڑی اور دیکھا کہ چند میلے چیتھڑوں میں لپٹا ہوا ایک لال بوٹی سا بچہ ننھا سا منہ کھول کر رو رہا ہے۔ "بھوکا ہوگا" یہ سوچ کر اس نے اپنے بچے کو چھاتی سے چمٹا لیا اور اپنی چولی کے بند کھولنے لگی۔

ماں تاکی عظمت انسانی تجسس پر غالب آئی اور سب لوگ مسکراتے ہوئے دکان سے باہر نکل آئے۔

چند منٹ کے بعد درگا دیوار کا سہارا لیتی ہوئی اٹھی۔ اور ڈگمگاتی قدموں مگر فاتحانہ نظروں کے ساتھ باہر چلی گئی۔ ایک ہاتھ سے وہ گود میں اپنے بچے کو تھامے ہوئی تھی۔ دوسرے ہاتھ میں اس کا جھبلا اور تھیلے میں ایک پائنیلی چاول۔

ماں

سلویا!

وہ ایک نرس تھی۔ دہلی کے ارون ہسپتال میں ملازم تھی دن بھر میں بارہ گھنٹے کی ڈیوٹی کرتی تب جاکر مہینے میں بنتالیس روپے نصیب ہوتے تھے ہر تیسرے مہینے رات کی ڈیوٹی کرنی پڑتی تھی۔ تیس یا اکتیس راتوں کو (فروری کا مہینہ آج تک اس کے حصے میں نہ آیا تھا) جاگتے جاگتے اس کی آنکھیں سرخ ہو جاتیں۔ دن میں سونے کا وقت تو ملتا مگر روشنی اور شور وغل میں رات کا چین کب نصیب ہوتا ہے۔ آخیر کی پانچ چھ راتوں میں تو اس کی یہ حالت

ہو جاتی کہ اگر ہر گھنٹے ٹھنڈے پانی سے مُنہ نہ دھوئے تو کھڑی کھڑی سو جائے۔

جنرل وارڈ جہاں اس کو کام کرنا پڑتا تھا۔ پچاس گز لمبا تھا۔ چالیس مریضوں کے پلنگ ایک طرف اور چالیس کے دوسری طرف، بیچ میں جو جگہ چھٹی ہوئی تھی۔ ایسی معلوم ہوتی جیسے جنگل کے بیچوں بیچ ایک سیدھی سڑک نکالی گئی ہو۔ اسی سڑک پر سلویا کو بارہ گھنٹے میں کم از کم پچاس پھیرے کرنے پڑتے۔ دس بارہ مرتبہ سپیشل وارڈ میں جانا پڑتا۔ چار پانچ مرتبہ باورچی خانے میں جاکر مریضوں کی خوراک کے متعلق ہدایات دینی ہوتیں۔ دو تین بار ڈاکٹر بلانے ہسپتال کے دوسرے سرے تک جانا ہوتا۔ کل ملا کر بارہ گھنٹے میں اسے تقریباً چھ سات میل پیدل چلنا پڑتا۔ بیٹھنے کی مہلت تو شاید ایک گھنٹہ کی بھی نہ ملتی تھی۔ چلنا نہ ہوتا تب بھی کھڑا رہنا پڑتا۔ روز کی اس تھکان سے اس کی ٹانگیں سوج گئی تھیں۔ کبھی کبھی تو یہ حالت ہو جاتی کہ قدم نکالنا مشکل ہو جاتا مگر پھر وہ تیل کی مالش سے تھکے ہوئے پٹھوں اور ابھری ہوئی رگوں میں کچھ جان ڈالتی اور اپنا روزانہ چکر جاری رکھتی۔ اس سے اگر جنت کے تخیل کے متعلق پوچھا جاتا تو وہ ضرور یہ کہتی کہ "جنت وہی مقام ہے جہاں میں چوبیس گھنٹے پلنگ پر لیٹی رہا کروں گی اور مجھے کھانا کھانے کے لئے بھی ٹانگیں ہلانے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔"

سلویا!

وہ ایک نرس تھی۔ بیماروں کو دوا پلانا۔ ان کی دیکھ بھال کرنا اس کا کام تھا۔ ہر تین گھنٹے کے بعد اسے بیماروں کا ٹمپریچر لینا۔ ہر تین گھنٹے کے

بعد اسی بیماروں کو دوا پلانا۔ ہر صبح انہی اسی بیماروں کے پلنگوں کی چادریں بدلنا اور پھر ان کے کپڑے بدلوانا۔ ہر ایک کا منہ دھلوانا۔ جو زیادہ بیمار تھے ان کو دن میں کئی کئی بار پیشاب پاخانہ کرانا۔ اگر وہ قے کریں تو تسلے ئے سامنے کھڑے رہنا اور پھر غلاظت سے بھرے ہوئے برتنوں کو اٹھا کر باہر لیجانا۔ کمزوری کی وجہ سے یا بیہوشی کی وجہ سے بعض بیماروں کو اپنے قویٰ پر قابو نہیں تھا۔ ان کو اٹھانا بٹھانا، ان کو کھانا کھلانا یہ سب اسی کے ذمے تھا۔ اگر اپنی بے چارگی کی وجہ سے ان کا پیشاب یا پاخانہ نکل جاتا تو سلویا پلنگ کی چادر بدلتی، کپڑے تبدیل کراتی اور پھر (ڈاکٹر کی ہدایات کے مطابق) فوراً مریض کی کمر پر تیل کی مالش کرتی۔

سلویا!

کیا وہ انسان نہیں تھی؟ کیا وہ مشین تھی؟ بے حس اور ان تھک؟ کیا مریضوں کی قے اور ان کی پیپ، ان کے پیشاب اور پاخانے سے اسکو کراہت نہ آتی تھی؟ کیا ان بیمار، زرد، یرقانی، جریانی، مفلسی جھریاں پڑے ہوئے چہروں کو دیکھتے دیکھتے اس کا احساس حسن بالکل فنا ہو گیا تھا۔ کیا وہ بھی دل اور دماغ رکھتی تھی؟ کیا اس کے دل میں بھی امنگیں تھیں؟ کیا اس کے دماغ میں بھی منصوبے تھے؟ کیا اس کے کان بیماروں کی کراہوں اور موت کی ہچکیوں کو سنتے سنتے اتنے بے حس ہو گئے تھے کہ ستار کی ایک گت، کسی خوش گلو کے ایک گانے، چڑیوں کے چہچہانے کا ان پر کوئی اثر نہ ہوتا تھا؟ کیا بیماری اور موت کی قربت نے زندگی اور زندگی کی تڑپ

کو بالکل فنا کر دیا تھا؟

مسلو یا!

وہ ایک نوجوان، خوبصورت نرس تھی۔ اپنے کام میں ہوشیار خلیق۔ ملنسار۔ ہنس مکھ، مگر سب نرسیں بظاہر ایسی ہی معلوم ہوتی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ان کے یہ سب طور طریقے بناوٹی ہوتے ہیں۔ دراصل وہ بڑی آوارہ، بڑی مطلب پرست ہوتی ہیں۔ ان کے کاٹے کا منتر ہی نہیں۔ کالج کے لڑکے۔ ہسپتال کے ڈاکٹر، جنسی بھوک کے مارے کلرک سب ہی تو ان کے شکار بنتے ہیں۔ اپنی سفید، کلپ لگی ہوئی وردی میں وہ ہمدردی اور رحم کا فرشتہ معلوم ہوتی ہیں مگر ان کے سیاہ دلوں میں سوائے نفس پرستی اور روپے کی محبت کے دوسرا کوئی جذبہ نہیں ہوتا۔ شائد نرسیں ایسی ہی ہوتی ہیں۔ شائد نہیں ہوتیں۔ کون کہہ سکتا ہے سوائے اس کے کہ عام طور سے انسان خواہ وہ فلم ایکٹرس ہو، مولوی ہو، پنڈت ہو یا نرس ہو پھر بھی انسان ہی ہوتا ہے اگر بعض نرسیں اپنی روزانہ کی مشقت اور کم تنخواہ سے تنگ آ کر اپنا دل اور جسم بیچنے پر مجبور ہو جاتی ہیں تو پھر بھی انسانیت سے تو عاری نہیں ہو جاتیں اگر اپنے ماحول کی کثافت اور بیماری کو بھولنے کے چند گھنٹوں کے لئے اپنے آپ کو کسی صحت مند، صاف ستھرے نوجوان کی گود میں بھول جاتی ہیں تو یہ تو ان کے انسان ہونے کے ثبوت ہے۔ شیطان اور فرشتے دونوں میں جذبات جیسی انسانی کمزوری کا پتہ بھی نہیں ملتا

سلویا !

وہ انسان تھی۔ انسانی کمزوریوں کا مجموعہ۔ نہ وہ پاکبازی کا فرشتہ تھی اور نہ عصمت وعفت کی دیوی، ایک دفعہ نہیں کئی بار اس نے تجرباتی معاشقے کئے تھے۔ معاملات جسمانی تعلقات تک بھی پہنچ چکے تھے۔ ہسپتال کی خشک، سخت اور غیر رومانی فضا کا ردعمل اگر سلویا جیسی نرسوں کے پاس تھا تو وہ بھی تھا، مریضوں کی کراہیں، قے اور پیپ کی بو، پھنسیاں اور پھوڑے، پیشاب اور پاخانہ، انجکشن اور اینما، پیشانی میں دھنسی ہوئی آنکھیں، پچکے ہوئے گال نیلی نیلی ابھری ہوئی رگیں، گلٹیاں اور رسولیاں اور فیل پائے ـــــ ان سب کو ایک لمحے کے لئے بھولنے کی صرف ایک ہی صورت تھی! کسی کے گرم گرم بدن کی قربت، اس کا سانس، اس کے بدن کی "صاف ستھری" بُو۔ ان سب میں کتنا جادو کا اثر تھا۔

مگر افسوس اس جادو کا اثر چند منٹ، زیادہ سے زیادہ چند گھنٹے ہی رہتا تھا۔ ہر ایسے تجربے کے بعد سلویا اپنے دل کو ایک نامعلوم درد سے بھرا پاتی۔ اس کو ایسا معلوم ہوتا جیسے اس کے ساتھ دھوکا کیا گیا ہو۔ اس کے "دوست" عام طور سے مہربانی سے پیش آتے تھے۔ اس کو سینما لے جاتے۔ تحفے خرید کر دیتے۔ موٹروں میں سیر کراتے۔ میٹھی میٹھی باتیں کرتے۔ غرض ایک کڑوی گولی پر ہر قسم کی شکر چڑھاتے مگر پھر بھی سلویا کے منہ میں کونین کا مزہ رہ جاتا۔ ان سب مہربانیوں کی آڑ میں اس کو بازار کی خرید و فروخت کی جھلک نظر آتی، ان میٹھی میٹھی باتوں میں ایک مالکانہ

لمحہ سنائی دیتا۔ چند گھنٹے کی تفریح کے بعد جب وہ اپنے ہاسٹل واپس آتی۔ جہاں وہ سات اور نرسوں کے ساتھ ایک بڑے کمرے میں رہتی تھی۔ اور اپنے پلنگ پر سونے کے لئے لیٹ جاتی تو اس کی زندگی کی تمام تکان، تمام تلخی، تمام تکلیفیں ایک دم واپس آجاتی اور چند لمحوں کے عیش و غفلت کے بعد یہ احساس ناکامی اور بھی شدید ہو جاتا اور اس وقت رات کے اندھیرے میں سلویا کی سوئی ہوئی روح بیدار ہو جاتی۔ جن امنگوں کو وہ ہر وقت دل میں بند رکھتی تھی۔ اس وقت ایک رُکے ہوئے دریا کی شدت سے امڈ آتیں۔ شادی، ایک ہمدرد، چاہنے والا، مہربان شوہر، ایک عمدہ، آرام دہ مکان، ایک بڑا سا نرم نرم بستر والا پلنگ...... اور ان سب سے زیادہ اہم...... بچے۔ سلویا کے اپنے بچے۔ کیا ان سب کو وہ کبھی حاصل نہ کر سکے گی؟ یہ وہ سوال تھا جو اکثر رات کی ڈیوٹی کے اوقات میں بھی پریشان کئے رہتا اور پھر اس کے قدم آپ سے آپ اسے بچوں کے وارڈ کی طرف لے جاتے اور وہ کسی ننھے مریض سے باتیں کرنے یا کھیلنے میں کھو جاتی —— یہاں تک کہ "مسٹر" کی کرخت چیخیں اسے پھر دنیا کی تلخ حقیقت کی یاد دلاتیں اور وہ اپنے وارڈ کی طرف لوٹ آتی۔

"ہاں!"

رات کا ایک بج چکا تھا۔ وارڈ میں چاروں طرف اندھیرا چھایا ہوا تھا مگر تاریکی کے اس سمندر کے بیچ میں روشنی کا ایک جزیرہ وہ میز تھی جہاں ایک لیمپ کی روشنی میں بیٹھی ہوئی سلویا مریضوں کی رات کی رپورٹ لکھ رہی تھی۔

نمبر ۱۴ کو پھر کالی کھانسی کی شکایت ہو گئی تھی۔ نمبر ۲۷ کمر میں درد کی شکایت کر رہا تھا۔ بے چارہ ڈیڑھ مہینے سے ایک ہی کروٹ پڑا تھا۔ درد نہیں ہوگا سو گیا ہوگا۔ نمبر ۴۵ شاید ہی صبح تک زندہ رہ سکے۔ اس کے سر میں بڑا گہرا زخم تھا۔ اندر کی رگیں کٹ جانے کا اندیشہ تھا۔ غریب شکل اور کپڑوں سے گاؤں کا رہنے والا معلوم ہوتا تھا۔ شاید آج ہی شہر آیا تھا۔ لاری کی جھپٹ میں آ گیا۔ اس وقت جو وہ بیہوش ہوا تو اب تک ہوش نہ آیا تھا۔ مگر یہ کس نے پکارا :-

"ماں !"

سلویا نے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی۔ اس اندھیرے میں دیکھنا تو ممکن نہ تھا۔ لیمپ کی روشنی میز کے علاوہ قریب کے دو پلنگوں تک ہی پہنچتی تھی مگر سلویا کے کان اس وارڈ کی آوازوں کے اتنے عادی ہو گئے تھے کہ وہ اندازاً بتا سکتی تھی کہ کسی کراہنے کی آواز کدھر اور کس کونے سے آئی ہے۔ کبھی تو یہ بھی بتا سکتی تھی کہ کون مریض کراہ رہا ہے مگر اس وقت وہ اپنے خیالات میں اتنی کھوئی ہوئی تھی کہ اندازہ نہ لگا سکی کہ کس مریض نے آواز دی۔ کچھ دیر انتظار کیا۔ کہ شاید اسی مریض کی پھر آواز سنائی دی مگر جب وارڈ کی خاموشی میں سوائے نمبر ۳۵ کے خراٹوں یا نمبر ۱۴ کی کالی کھانسی کے اور کوئی آواز نہیں سنائی دی تو وہ پھر اپنے دماغ میں سمٹ گئی۔

آج رات کو رپورٹ لکھنا سلویا کو عجیب لگ رہا تھا کیونکہ یہ اس کی آخری رپورٹ ہوگی۔ آج اس کی آخری رات کی ڈیوٹی ہے۔ کل سے۔

اس منحوس ہسپتال کا منہ بھی نہ دیکھے گی۔ نہ مریض ہوں گے نہ شب بیداری ہوگی، نہ اس وارڈ کے چکر لگانے پڑیں گے۔ نہ مریضوں کا پیشاب پاخانہ اٹھانا پڑے گا۔ یہ اس کی غلامی کی آخری رات تھی۔ کل سے وہ آزاد ہوگی۔ آزادی یہ خیال کتنا خوشگوار تھا۔ جس نے اس وارڈ سے اس کو اٹھا کر جنت میں پہنچا دیا۔ جہاں خوشی ہی ہوگی۔ آرام ہی آرام۔ ایک عمدہ سا مکان۔ مکان کے ارد گرد باغ۔ باغ میں پھولوں کے درخت۔ مکان میں ایک نرم نرم بستر والا پلنگ اور ایک ہمدرد چاہنے والا شوہر!

جارج کا خیال آتے ہی سلویا کی شفاف پیشانی پر فکر کی ایک ہلکی سی شکن پڑ گئی۔ یہ بات نہیں ہے (اس نے اپنے دل کو یقین دلایا) کہ جارج ایک قابل قدر شوہر نہیں ہے۔ این ڈبلیو آر میں گارڈ ہے۔ ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار تنخواہ پاتا ہے۔ ہر سال ترقی ملتی ہے۔ بڑھتے بڑھتے تنخواہ ڈھائی سو ہو جائے گی۔ اب بھی وہ ایک چار کمروں والے مکان میں رہتا ہے اور اس کے ارد گرد باغیچہ بھی ہے۔ چھوٹا ہی سا۔ مگر ہے تو۔ رہا نرم نرم بستر والا پلنگ، تو وہ بھی ضرور ہوگا۔ جارج نے جب سلویا کو دو تین بار اپنے ہاں چائے پر اور ایک بار کھانے پر بلایا تھا تو سونے کے کمرے میں جانے کا کوئی موقع نہ آیا تھا۔ بات یہ تھی کہ جارج باقاعدہ گرجا جانے والا ایک مذہبی قسم کا انسان تھا۔ رواجی اخلاقیات کا سخت پابند۔ اس نے تو اب تک سلویا کو چوما بھی نہیں تھا بستر تک پہنچنے کا تو ذکر ہی کہاں!

جارج اور بستر کا خیال ایک ساتھ آتے ہی معلوم نہیں کیوں، سلویا کو

ایک جھرجھری سی آگئی اور ہر لحاظ سے جارج ایک مناسب اور معقول شوہر معلوم ہوتا تھا۔ جب سے سلویا اس سے اپنی پھوپھی کے ہاں کرسمس کی رات کو ملی تھی وہ نہایت مہربانی، نہایت اخلاق بلکہ یوں کہئے شفقت کے ساتھ پیش آیا تھا مگر محبت؟ تو وہ کوئی نوجوان لڑکا تھوڑے ہی تھا کہ بات بے بات اپنی محبت کا اظہار کرتا یا اندھیرے کونوں کھدروں کی تاک میں رہتا کہ کب موقع ملے اور کب کسی لڑکی کو چوم لے۔ اس کی عمر ایسی حرکتوں کے قابل نہ تھی۔ اس کی عمر؟ "کچھ ایسی زیادہ نہیں ہے" سلویا نے اپنے آپ کو سمجھایا "ہو گی یہی پینتیس چالیس برس۔ حد سے حد پینتالیس۔ اور پچاس سے زیادہ تو کسی صورت میں ہو ہی نہیں سکتی۔ کیونکہ ابھی تو اس کی پنشن ہونے میں کئی برس باقی ہیں" اس کی پہلی بیوی کے مرے دس برس گذر چکے تھے۔ اس وقت سے وہ اکیلا ہی رہتا تھا۔ بال بچہ بھی کوئی نہ تھا۔ جب اس نے سلویا سے شادی کی درخواست کی تو کہا تھا "سلویا۔ دیکھو میں اتنے مکان میں اکیلا ہی رہتا ہوں۔ میرے کھانے پینے۔ کپڑے لتے کی خبر لینے والا بھی کوئی نہیں۔ ڈیڑھ سو تنخواہ ملتی ہے۔ وہ سب نوکر اڑا دیتا ہے۔ تم مجھ سے شادی کر لو تو میری دنیا سدھر جائے" بس اتنا ہی۔ سلویا کے دل نے ان الفاظ کو ناکافی سمجھا۔ وہ چاہتی تھی کہ کوئی شادی کی تجویز جوشیلے اظہار محبت کے ساتھ کرے "تم میری زندگی کا روشن ستارہ ہو۔ تمہارے بغیر میرا جینا محال ہے۔ تم میرے دل کی دنیا میں ہمیشہ کے لئے آن بسو تو میرے من میں بہار آجائے" مگر سلویا کے دماغ نے کہا "بیوقوف

ایسے موقع کو ہاتھ سے مت جانے دے۔ محبت کا اظہار تو بہت سے نوجوانوں نے کیا ہے مگر ایک نرس سے شادی کرنے کا ارادہ تو ایک نے بھی ظاہر نہیں کیا؛ دل پر دماغ غالب آیا اور سلویا نے "ہاں" کر دی۔

"ماں!"

اندھیرے کے سمندر کی تہہ میں سے ایک کمزور آواز نے پکارا۔ سلویا کے خیالات کا سلسلہ منتشر ہو گیا۔ اس آواز میں کچھ ایسا درد بھرا تھا کچھ ایسی فریاد تھی کہ اس سے نہ رہا گیا۔ وہ ٹارچ لے کر کھڑی ہو گئی۔ آواز دائیں ہاتھ کے کونے سے آئی تھی۔ وہ مریضوں کے چہروں پر روشنی ڈالتی ہوئی چلی۔ نمبر ۵۰ کمبل اوڑھے آرام سے سو رہا تھا۔ اب اس کا ٹائیفائڈ جاتا رہا۔ دو چار دن میں جانے والا ہے۔ نمبر ۵۱ کی کمر کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ اس لئے الٹا منہ کے بل سوتا ہے۔ نمبر ۵۲ کو صرف ملیریا کی شکایت ہے جو اس وارڈ میں سب سے کم مہلک مرض ہے۔ نمبر ۵۳ کو بواسیر کی بیماری ہے۔ آپریشن ہونے والا ہے اور نمبر ۵۴ ——— معلوم نہیں یہ بے چارہ زندہ بھی ہے یا چل بسا۔ سلویا کی ٹارچ کی روشنی نمبر ۵۴ کے منہ پر پڑی۔ پٹیاں بندھی ہوئی تھی۔ مگر ان میں سے نکلا ہوا چہرہ ایک کسان کا تھا۔ جس کی عمر کوئی پچاس برس کے قریب ہوگی۔ شام ہی اس کو داخل کیا گیا تھا مگر اس وقت سے وہ بیہوش تھا۔ ڈاکٹر نے کہا تھا کہ اگر اسے رات کو ہوش آجائے تو فوراً اطلاع دی جائے اور اگر ہوش نہ آیا تو اس کے بچنے کی کوئی امید نہیں ہے۔

"ماں!"

پٹیوں کے اندر سے دبی ہوئی آواز مظلوم کی فریاد کی طرح نکلی۔ تو نمبر ۴ ۵ ہوش میں آ رہا ہے۔ سلویا نے یہ سوچا اور فوراً باہر دوڑی۔ ڈاکٹر کو اس کے کمرے سے بلا لائی۔ ڈاکٹر نے معائنہ کیا اور ایک انجکشن دیا۔ ایک دوا بھی دی کہ جب ذرا زیادہ ہوش آئے تو پلا دی جائے۔ مریض کے بچنے کی ہلکی سی امید ہو چلی۔

ڈاکٹر واپس چلا گیا۔ مگر سلویا نمبر ۴ ۵ کے پلنگ کے پاس کھڑی رہی مریض کے بدن میں موت اور زندگی کی کش مکش ہو رہی تھی۔ مقابلہ سخت تھا۔ اس کا سیاہ بالوں والا ہاتھ جو سفید چادر پر رکھا ہوا تھا۔ دفعتاً شدتِ کرب سے آپ سے آپ اٹھتا۔ پھر بے جان ہو جاتا۔ ایک دفعہ ہاتھ کی انگلیوں نے پلنگ کو ٹٹولا کہ کسی چیز کو پکڑ لیں مگر چکنی چادر پھسل گئی اور انگلیاں تشنج کے زور سے ایک دوسرے میں گھس گئیں۔ پٹیوں کے اندر سے دبی ہوئی آواز آئی۔ "ماں" سلویا نے اپنا نرم ہاتھ بوڑھے کسان کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ بخار سے تپ رہا تھا۔ ہلکے ہلکے سہلانے لگی۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس سے کچھ آرام پہنچا۔ کیونکہ تشنج میں کمی ہو گئی۔

"ماں۔ ارے میری ماں"

اس دفعہ نمبر ۴ ۵ کی آواز زور سے نکلی۔ سلویا دواؤں کے کمرے میں گئی اور ایک خوراک بنا کر لے آئی۔ ایک ایک چمچہ کر کے پلائی۔ بوڑھا کسان آدھا ہوش میں تھا۔ منہ بھی مشکل سے کھولتا تھا۔ اور کھلتا تھا تو

اس میں سے یہی آواز آتی تھی "ماں - ارے میری ماں"

"ہاں بیٹا۔ یہ دوا پی لو" سلویا نے آہستہ سے، نرمی سے، محبت سے کہا۔ بوڑھا کسان جس کا نیم بیہوشانہ دماغ معلوم نہیں بچپن کی کس وادی میں سیر کر رہا تھا۔ بڑبڑایا "اچھا ماں" اور اس نے دوا پی لی

ہسپتال کے گھنٹے نے چار بجائے مگر سلویا نمبر ۴ کے سرہانے سے نہ ہٹی۔ ایک مہینہ رات کی ڈیوٹی کرتے کرتے ہو گیا تھا ٹانگیں تھک کر چور ہو گئی تھیں۔ چند گھنٹے پہلے اس کا جی چاہ رہا تھا کہ میز پر سر رکھ کر ہی سو جاؤ مگر کسی مریض کو تکلیف میں دیکھ کر اس کو نہ معلوم کیا ہو جاتا تھا۔ نہ نیند رہتی تھی نہ ٹانگوں کی تکان۔ اس کے دل کی امنگیں، دماغ کے منصوبے، جوانی کے خواب، ماں بننے کی حسرت —— کوئی جذبہ، کوئی خیال بھی تو باقی نہ رہتا۔ اگر کوئی خیال رہتا تو یہی کہ اس مریض کی تکلیف کسی طرح کم ہو جائے۔ جب وہ کسی مریض کو ایسے شدید مرض میں مبتلا دیکھتی کہ جان کا خطرہ ہوتا تو اس کو ایسا معلوم ہوتا گویا وہ ایک میدان جنگ میں ہے اور موت کی بے پناہ فوجوں سے تن تنہا مقابلہ کر رہی ہے اور اگر اس مریض کی جان بچ جاتی تو سلویا کو وہی خوشی محسوس ہوتی جو کسی ملک کے فاتح کو ہوتی ہے۔ موت انسان کی سب سے زبردست دشمن ہے۔ اس کو زیر کر کے سلویا کا دل خوشی سے پھولا نہ سماتا۔

"ماں!"

اس دفعہ بوڑھے کسان کی آواز میں کرب کم تھا اور سکون زیادہ

سلویا پھر ہلکے ہلکے ہاتھ سہلانے لگی اور دوسرا ہاتھ اس کی جلتی ہوئی پیشانی پر رکھ دیا۔ تھوڑی دیر میں اس کو آرام سے سوتا دیکھ کر اس کو جو خوشی ہوئی وہ ان تمام تکلیفوں کا بدلہ تھی جو سلویا نے پانچ سال کی نرسنگ میں اٹھائی تھیں موت کے لشکر پیچھے ہٹ گئے تھے!

اور دفعتہ سلویا کو ایسا محسوس ہوا کہ یہ وارڈ، یہ مریض، یہ ہسپتال، یہ سب اس کی زندگی کا ایک اہم جزو بن چکے ہیں۔ ان کے بغیر اس کا جیون ادھورہ رہ جائے گا۔ جب جارج اپنی ڈیوٹی پر جایا کرے گا تو وہ اکیلی، بے کار گھر میں بیٹھی کیا کرے گی؟ پھر وہ موت کے لشکروں کا مقابلہ کر کے ان کو کیسے شکست دے گی؟ دوسری نرسیں کبھی کبھی تھک کر سو جاتی ہیں اگر وہ بھی رات سو گئی ہوتی اور اس بوڑھے کسان کی آواز نہ سنتی تو وہ بے چارہ ممکن ہے مر جاتا۔ نہیں، ہرگز نہیں۔ یہ کام وہ نہیں چھوڑ سکتی۔

مگر جارج نے تو پہلے ہی صاف صاف کہہ دیا تھا کہ "میں نرسنگ ورسنگ کی اجازت نہیں دوں گا۔ میں یہ گوارا نہیں کر سکتا کہ میری بیوی نرس کہلائے"! یہ خیال آتے ہی سلویا کی آنکھوں کے سامنے سے ایک پردہ ہٹ گیا اور اس کے پیچھے جارج اپنے اصلی خد و خال میں نظر آیا۔ سلویا اس کو دیکھ کر کانپ اٹھی۔ "کیا اسی شخص کے واسطے میں اپنا کام، اپنی زندگی قربان کر رہی تھی؟" چھوٹا قد، سینہ چڑیا جیسا۔ چیونٹی جیسی مونچھیں جو سگرٹ کے دھوئیں سے زرد ہو گئی تھیں۔ زرد زرد دانت جن میں سے کئی نقلی۔

سر گنجا۔ دماغ قدامت پرست خیالات سے بھرا ہوا۔ اپنے پرانوار کو گرجا جانے کا کتنا غرور۔ مگر مذہب کی روح سے کتنا دور۔ یہ آج کل کے آوارہ لڑکے اور لڑکیاں خداوند یسوع مسیح کے حکم سے جہنم میں جلائے جائیں گے۔ میں نے سنا ہے زینب بڑی آوارہ ہوتی ہیں۔ تم تو ایسی نہیں ہو سلویا؟"

"ہاں میں تو ایسی ہی ہوں۔ میں نے تو کئی مردوں سے محبت کی ہے بلکہ محبت سے بھی زیادہ" سلویا یہ سوچ کر مسکرا دی۔ جب وہ یہ کہے گی تو جارج پر کیا اثر ہوگا۔ شادی کو وہ خود ہی منسوخ کر دے گا۔ اس کو تو اپنے گھر کے لئے کوئی ماما چاہیئے۔ ویسی بیوی اس کو مل ہی جائے گی"

"مگر بچے؟" اولاد کی تمنا نے پھر سلویا کے قدم ڈگمگائے۔ مامتا کا یہ جذبہ جس سے اس کا دل بھرا ہوا تھا۔ شادی کے بغیر اس کا کیا ہوگا؟ وہ ماں کیسے بن سکے گی؟

"ماں!"

نیند میں بوڑھا کسان بڑبڑایا۔

صبح ہو چکی تھی۔ کھلی ہوئی کھڑکیوں میں سے ہلکی ہلکی روشنی وارڈ میں پڑ رہی تھی۔ سلویا نے نظر اٹھا کر دیکھا۔ اسی مریض۔ اس کے اسی مریض، اس کے اسی بچے۔ اس کی اولاد۔ جن کی دیکھ بھال اس کا فرض تھا۔ ان کو کھلانا پلانا۔ دوا دینا۔ ان کا منہ دھلانا۔ کپڑے بدلوانا۔ ان کی تپتی ہوئی پیشانیوں پر محبت اور شفقت کا ہاتھ رکھنا۔ جب وہ موت سے لڑتے ہوئے پکاریں "ماں" تو "ہاں بیٹا دوا پی لو" کہہ کر ان کو سہارا دینا

وارڈ کے دوسرے کنارے سے کسی کے کھانسنے کی آواز آئی۔ نمبر ۱۲ کو پھر کالی کھانسی ستا رہی ہے۔ ایک پیالی گرم چائے کی پلا دوں تو آرام ہو جائے گا یہ سوچا اور سلویا بوڑھے کسان کے ہاتھ کو ہلکے سے تھپک کر پلنگوں کے بیچ میں سے ہوتی ہوئی چلی گئی۔ نہ اس کی چال میں تکان تھی اور نہ اس کی آنکھوں میں نیند۔

پاؤں میں پھول
خواجہ احمد عباس
فلمی کہانی و مکالمہ نویس

آزادی کا دن ؟
دکان

سلیقے اور صفائی پسندی پر ناز تھا۔ اس کو معلوم تھا کہ اس کے گاہک اسی وجہ سے اس کے ہاں دوبارہ آنا پسند کرتے ہیں۔ ایک پیکٹ کھول کر اس نے سفید براق پلنگ کی چادر نکالی اور دوسرے میں سے تکیئے کے غلاف۔ بستر کو جھاڑا، چادر تبدیل کی، تکیوں پر غلاف چڑھائے۔ ایک اور پیکٹ میں سے پھول دار ٹمبل کلاتھ نکال کر گول میز پر بچھایا۔ گلدان میں پھول لگائے، گلاس کو دھو کر چمکایا اور ٹرے میں لگا کر میز پر رکھ دیا، بوتلیں تو فوجی اپنے ساتھ ہی لاتے تھے، مگر تمیز دار ڈوروتھی اپنے ہاں انہیں بوتل سے منہ لگا کر پینے کی اجازت کبھی نہ دیتی تھی۔

اب صرف ایک چھوٹا سا پیکٹ رہ گیا۔ یہ لے کر وہ بالکنی میں آئی۔ بائیں طرف نظر گئی تو لوسی کی بالکنی میں دھلے ہوئے پیٹی کوٹ اور جمپر لٹکے ہوئے نظر آئے، گندی، بدتمیز کہیں کی، اپنی گند کا یوں اشتہار کرتی ہے! داہنی طرف دیکھا تو ایڈیتھ کی بالکنی میں ایک مرد کی پتلون الگنی میں لٹکی ہوئی نظر آئی، بے شرم کہیں کی! ان لڑکیوں کو تمیز یا نفاست تو چھو نہیں گئی، اٹھارہ اٹھارہ برس کی ناتجربہ کار چھوکریاں جب پیشہ کرنے لگیں گی تو اور کیا امید ہو سکتی ہے۔ اور سمجھتی ہیں اپنے آپ کو کلیوپیٹرا!

پانچ منزل نیچے چند گورے شراب کی بوتلیں لئے ٹہل رہے تھے، ڈوروتھی نے جلدی سے پیکٹ کھولا اور اس میں سے ایک خوبصورت نیا یونین جیک نکال کر اپنی بالکنی کے کٹہرے پر لٹکا دیا۔ نہایت احتیاط سے اور بڑے فخر سے۔ اس کے بعد اس نے ایڈیتھ اور لوسی کے کردار کی طرف

حقارت اور کسی قدر رحم کی نگاہ سے دیکھا، زینے پر بھاری جوتوں کے چڑھنے کی آواز آ رہی تھی، چند لمحے ہی میں اس کے دروازے کی گھنٹی، ڈورو تھی کی فتح کا اعلان کر رہی تھی۔

۲۔ مذاق

بابو باری سال سے کلکتے تک پیدل چل کر آیا تھا، ان دنوں میں جب کال کا زور تھا۔ اس نے سینکڑوں کو مرتے دیکھا تھا، بوڑھوں کو، دودھ پیتے بچوں کو، جوان عورتوں کو، مگر وہ نہ مرا تھا۔ اسے خود تعجب تھا کہ وہ کیوں زندہ بچا، اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ وہ اکیلا تھا۔ نہ ماں، نہ باپ، نہ بیوی، نہ بچے، نہ بہن، نہ بھائی، جدھر جی چاہتا چل دیتا، صبح سویرے جب اور سب سوتے ہوتے وہ بھیک مانگنے نکل جاتا۔ کوڑے کرکٹ کے ڈھیر میں سے پھل ترکاریوں کے چھلکے، سڑا ہوا آم، روٹی کا جوٹھا ٹکڑا۔ جو کچھ بھی ملتا سب سے پہلے نکال لیتا۔ غرض کسی نہ کسی طرح وہ اپنے پیٹ کے دوزخ کے ایندھن کا انتظام کر ہی لیتا۔ جب ریلیف کمیٹی کے لنگر خانے کھلے تو وہ اپنی ہانڈی لئے لائن میں ہمیشہ سب سے آگے ملتا۔ سب سے پہلے گرم گرم کھچڑی اسی کو ملتی، اس کی بھی اس نے ترکیب سوچ رکھی تھی۔ لنگر خانہ کھلنے سے کئی گھنٹے پہلے وہ پہنچ جاتا تھا، اور عین اس جگہ جہاں سے لائن شروع ہوتی تھی وہ پاؤں پسار کر سو جاتا۔ اگر کوئی اس کی جگہ لینے کی جرأت بھی کرتا تو وہ اس کو لات مار کر ہٹا دیتا۔

لوگ کہتے تھے کہ وہ میل بھر پرے سے کھانے کو سونگھ لیتا ہے، کہیں خیرات کا کھانا بٹ رہا ہو بابو وہاں موجود، کہیں جوٹھا پتّل پڑا ہو بابو وہاں سب سے پہلے پہنچ جاتا، کہیں رسوئیات رات کا جوٹھا کھانا پھینک رہا ہو بابو زمین پر شپ پہنچ دیتا، ہوا میں سے لپک لیتا۔ اس کی ساری حسوں کا ایک ہی مرکز ہو گیا تھا۔ خوراک —— کتنی دور بھی کھانا پک رہا ہو اس کے نتھنے پھڑکنے لگتے، شکاری کتوں کی طرح۔ رات کے اندھیرے میں بھی اسے کھانے کی چیز پڑی نظر آجاتی، وہ سوتے میں خواب بھی دیکھتا تو پوریوں کے انبار، چاول کے ڈھیر، مٹھائیوں کے پہاڑ نظر آتے، جاگتا رہتا تو ہر لمحہ اگلا نوالہ حاصل کرنے کے لئے اسکیم بناتا رہتا، کوئی جرنیل بھی اس محنت سے اپنی فوجی مہم کا نقشہ نہیں بناتا، جس انہماک سے بابو روٹی کے ایک ٹکڑے یا چاول کی ایک مٹھی کے لئے پہلے سوچ بچار اور دوڑ دھوپ کرتا تھا، کوئی عاشق اپنے معشوق کی دھن میں اتنا کھویا نہیں ہوتا جتنا بابو کھانے کے خیال میں۔ بھوک نے اس کی ہر حس، اور اس کے ہر ذوق کو فنا کر دیا تھا وہ کسی حسین لڑکی کو بھی دیکھتا تو سوچتا اس کے گال خمیری روٹی کی طرح پھولے ہوئے ہیں، اس کی رنگت تو دیکھو انار کی طرح سرخ ہے، کاش یہ لڑکی، لڑکی نہ ہوتی ایک خمیری روٹی ہوتی، انار کا ایک دانہ ہوتی، ایک سیب ہوتی، ایک رس گلہ ہوتی ...... اور وہ اپنے دماغ میں ہر لذیذ کھانے کا نام لے ڈالتا۔

سرکاری اعلان کے بموجب اب کال نہ رہا تھا۔ باہر کے آئے

قحط زدہ کسانوں کو شہر سے نکال دیا گیا تھا۔ مگر بابو کسی نہ کسی طرح پولیس کی نظر سے بچ گیا تھا، اب تک وہ کلکتے ہی میں تھا، مگر حالات بد سے بدتر ہوتے جا رہے تھے۔ ریلیف کمیٹیوں کے لنگر خانے بند ہو گئے تھے۔ کال کا خوفناک سایہ کسانوں کے جھونپڑوں پر سے پھیلتا ہوا اب شہر کے سفید پوش گھرانوں پر پڑ رہا تھا، اب کوئی خیرات بھی نہ دیتا تھا۔ اب کوئی جوٹھا کھانا بھی کوڑے کے ڈھیر پر نہ پھینکتا تھا۔ اب بابو کھائے تو کہاں سے! چوری کرے؟

مگر عجیب بات تو یہ تھی کہ اب تک بابو نے پیٹ بھرنے کے لئے ہر جتن کیا ـــــ بھیک مانگی، جوٹھا کھایا، کوڑے کے ڈھیروں کو کریدا، مگر چوری نہ کی تھی، نہ جانے کیوں (اس کا دل اس کے لئے تیار نہ تھا ـــــ پولیس کا خوف مانع تھا یا پرماتما کا؟) مگر کوئی جذبہ تھا ضرور جو اس کو ہر بار چوری سے باز رکھتا تھا۔

ہر بات کی ایک حد ہوتی ہے۔ شرافت کی بھی، جب تین دن فاقے سے گذر گئے تو بابو کا ایمان بھی پگھل گیا، پیٹ اندر اتنا دھنس گیا تھا کہ چلنا مشکل تھا، آنکھوں میں ایک عجیب نیند سی چھائی رہتی جو دراصل نیند نہیں تھی بلکہ کمزوری تھی۔ موت کا پیغام تھی، چلنا دوبھر ہو گیا، کھانے کی تلاش کرے تو کیونکر؟ بھیک مانگنے کے لئے زبان ہلانے کی طاقت بھی بدن میں نہ رہی۔ دماغ میں سوچنے کی، دل میں محسوس کرنے کی اہلیت نہ رہی۔ تمام دنیا سمٹ کر ایک روٹی کی شکل میں اس کے شعور پر چھا گئی۔

بابو نے سوچ لیا کہ اب اگر اسے کہیں موقع ملا تو وہ ضرور چوری کرے گا۔ مگر کہاں ـــــ ؟ کسی کے گھر میں گھسا تو رسوئی تک پہونچنے سے پہلے ہی مرمت کردی جائے گی۔ پھر بھی وہ تلاش میں نکلا۔ دھرمتلہ سے ولزلی اسٹریٹ ہوتا ہوا چورنگی کی طرف چلا، آج نہ جانے کیا بات تھی تمام شہر میں چہل پہل مچی ہوئی تھی، رنگ برنگے جھنڈے جھنڈیاں گرجاؤں میں گھنٹیاں بج رہی تھیں۔ ہنستے اور گاتے چھوروں کے غول کے غول، اچھے اچھے کپڑے پہنے ہوئے لڑکیوں کے جھنڈ ہوٹلوں کی طرف جاتے ہوئے اور بہت سے فوجی جو سڑکوں پر کھڑے یا مکانوں کی دہلیزوں پر بیٹھے بوتلوں سے شراب پی رہے تھے "شاید کوئی تہوار ہوگا" بابو نے سوچا۔ اور پھر دفعتاً اس کے دماغ میں خیال آیا کہ شراب سے بھی تو پیٹ بھر سکتا ہے۔ ایک مکان کی سیڑھی پر دیکھا ایک فوجی بوتل ہاتھ میں لئے مدہوش بیٹھا ہے، سدھ بدھ کی خبر نہیں، بوتل آدھی سے زیادہ خالی تھی، ہاتھ سے گرا ہی چاہتی تھی۔ بابو نے ادھر اُدھر نظر کی اور گلی کو خالی پاکر ایک جھپٹے میں بوتل چھین لی۔ ایک کونے میں جاکر اس نے ایک نامانوس بدبو کی پرواہ نہ کرتے ہوئے بوتل منہ سے لگائی اور غٹ غٹ کرکے پی گیا

پہلے تو یہ معلوم ہوا کہ اس کے حلق میں کسی نے آگ لگادی، پھر یہ آگ پھیلتے پھیلتے انتڑیوں تک پہنچ گئی۔ بھینچے ہوئے پیٹ میں ایک عجیب تناؤ محسوس ہوا۔ جیسے ڈھیلے طبلے کو کسا جائے، اور اس کے بعد کسی نے بابو کی پیشانی پر ایک زور کا گھونسا رسید کیا، سر اٹھایا تو

دیکھا دیا تھی۔ انتقاماً بابو نے بھی گھونسا اٹھایا اور پتھر پر دے مارا۔ ہاتھ جھنا کر رہ گیا " بات تیرے کی " اور وہ آگے بڑھ گیا۔

نہ جانے کہاں کہاں ہوتا ہوا وہ کہاں پہنچ گیا۔ مگر اس کے نتھنوں نے یہ ضرور محسوس کیا کہ وہ کھانے کی چیزوں سے دور نہیں ہے۔ کوشش کر کے آنکھیں پھاڑ کر دیکھا تو اس کے تمام خواب اصلیت کے لباس میں نظر آئے، سامنے بھنی ہوئی مرغیاں، لال بٹر سیلڈ کی قابیں، کیک مٹھائیاں نہ جانے کیا کیا رکھا ہوا تھا۔ نشہ میں گھومتا گھامتا وہ گرانڈ ہوٹل کے باورچیخانے کے قریب پہنچ گیا تھا۔ اس کے اور ان نعمتوں کے درمیان صرف ایک دروازہ حائل تھا، اور وہ بھی کھلا ہوا، بلا کوئی خوف یا جھجک محسوس کئے ہوئے وہ اندر چلا گیا، میز کی طرف ہاتھ بڑھانا ہی چاہتا تھا کہ اس کی نظر ایک سوکھی ڈبل روٹی کے ٹکڑے پر پڑی، جو ایک چھری کے پاس پڑا ہوا تھا، نہ جانے کیوں اس کے دماغ نے کہا " روٹی! " اور اس سے پہلے کہ وہ اور بڑھیا کھانوں کی طرف توجہ کرے اس کے ہاتھ نے وہ آدھی کٹی ہوئی روٹی اٹھالی " روٹی! آہ روٹی! " اس کے دل نے خوشی سے ناچ کر کہا۔ بابو نے روٹی کا ٹکڑا اپنے منہ کی طرف بڑھایا، خمیری آٹے کی سوندھی سوندھی خوشبو نے اس کے نتھنوں کو معطر کر دیا " آہا ہا " اس نے سوچا۔ " روٹی سے بڑھ کر کوئی نعمت دنیا میں نہیں " دانتوں سے کاٹنے کے لئے منہ کھولا ہی تھا!

.... منہ کھلا کا کھلا ہی رہ گیا، کئی باورچی آگئے، بابو کپڑا گیا،

روٹی کا ٹکڑا اس کے ہاتھ سے چھین لیا گیا، اس کو پولیس کے حوالے کر دیا گیا، اور جاتے جاتے اس نے ایک خانساماں کو یہ کہتے ہوئے سنا "سالا۔ وکٹری ڈنر کھانے آیا تھا" بابو کو ڈنر کے معنے معلوم تھے، مگر وکٹری کے نہیں، اس لئے حوالات کے اندھیرے میں وہ کئی گھنٹے سوچتا رہا کہ وکٹری کیا بلا ہے۔

اور پھر کچھ آہٹ ہوئی، روشنی کا ایک ٹکڑا ــــ گول روٹی کی شکل کا ــــ حوالات کی زمین پر پڑا۔ زمین پر لوہے کے ایک تھال کے گھسٹنے کی آواز آئی۔ کسی نے کہا۔ "یہ لے" بابو نے زمین کی طرف نگاہ کی اور دفعتًا ہنس پڑا۔

"ابے ہنسنے کی کیا بات ہے؟" سپاہی نے ڈانٹ کر کہا۔

"ہنسنے کی بات نہیں ہے؟ تم مذاق کرتے ہو یار" اور بابو اور بھی کھلکھلا کر ہنس پڑا، اور ہنستا رہا۔ جیسے ہنسی کا دورہ پڑ گیا ہو۔ ہر بار جب تھک کر وہ ہنسی کو روکتا تو اس کی نگاہ زمین کی طرف جاتی اور پھر بے اختیار ہنسی کا دورہ شروع ہو جاتا۔

"پاگل ہے سالا" یہ کہہ کر سپاہی چلا گیا مگر بابو برابر ہنستا رہا ــــ کیونکہ زمین پر لوہے کا تھال پڑا تھا، اور اس تھال میں آدھی ڈبل روٹی کا سوکھا ہوا ٹکڑا۔

۳۔ قانون

"اجی سرکار! میری بیٹی اور بیوی کا حصّہ بھی دیدو۔"

"چل بے۔ جھوٹ بولتا ہے؟ بیوی بیٹی ہیں تو ان کے پاؤں میں مہندی لگی ہے کہ اپنا حصّہ خود نہیں لے سکتیں۔"

رامو بڑا غیرت دار آدمی تھا، وہ اپنے حصّے کی چار پوریاں اور دو لڈو لے کر ہٹ آیا، مگر اس نے یہ کہنا گوارا نہ کیا کہ اس کی بیوی بیٹی اس لئے نہ آئی تھیں کہ ان کے پاس پہننے کو کچھ نہ تھا جو چیتھڑے پہنے گھر میں بیٹھی رہتی تھیں۔ ان میں سے آدھا بدن نظر آتا تھا اس لئے وہ ان کو باہر نکلنے نہ دیتا، سارے گھر میں بس ایک دھوتی تھی جو پہن کر وہ باہر کام کرنے نکلتا، تنخواہ کے دن وہ سارے شہر میں مارا مارا پھرا تھا کہ پانچ پانچ روپے میں بھی مل جائیں تو وہ دھوتیاں خرید لے چاہے مہینے بھر ایک وقت ہی کھانا ملے۔ مگر پانچ روپے تو کیا بیس روپے میں بھی دھوتی دستیاب نہ ہوئی تھی۔ سارے چاندنی چوک میں بڑی دکانوں پر بھی گیا۔ چھوٹی دکانوں پر بھی مگر کہیں نہیں، کسی جگہ "ہاں" نہ سنا۔ ایک دکاندار دبے لہجے میں یہ ضرور کہا تھا۔۔۔ "میاں تمھیں ایسی ہی ضرورت ہے تو میں کہیں سے دھوتیوں کا انتظام کئے دیتا ہوں۔۔۔ پچاس روپے ہوں گے" پچاس روپے! اور اسے مہینے بھر تک بلیس ڈھونے کے ملتے تو تھے صرف پچیس روپے! پچاس روپے وہ کہاں سے لائے؛

اور پھر وہ کام پر سے بھی ہٹا دیا گیا تھا، امریکن فوج کے لئے جو بارکیں بن رہی تھیں وہ وہاں مزدوری پر لگا ہوا تھا۔ مگر اب سنا تھا کہ یہ فوجیں واپس جانے والی ہیں اس لئے جو بارکیں بنی ہوئی ہیں وہ بھی ڈھا دی جائیں گی۔ لاکھ کوشش کی پھر بھی اسے کام نہ ملا۔ بے کار ہوتے اسے ڈیڑھ مہینہ ہو چکا تھا...... دو دن سے گھر میں فاقہ تھا ــــ آج اس نے طے کیا تھا کہ کچھ نہ ہو تو بھیک مانگنا ہی شروع کر دیگا مگر سویرے سے ہی چراغ دین اور مسیتا کہہ گئے تھے کہ ٹھیکیدار کہنا سنگھ کے ہاں پوریاں اور لڈو بٹ رہے ہیں! وہ بھاگا بھاگا وہاں گیا، چار پوریاں اور دو لڈو، بھگوان بھلا کرے ٹھیکیدار صاحب کا۔ سنا تھا سرکار کی جو جیت ہوئی ہے اس خوشی میں غریبوں کو دان دے رہے ہیں۔ مگر تین آدمیوں کے کنبہ میں چار پوریوں اور دو لڈو سے کیا کام چلے گا، اگر بیوی کا حصہ بھی مل جاتا تو غنیمت تھا، مگر ان کے یہاں آئے بغیر یہ ناممکن تھا۔ اب ان کو لائے تو کیونکر؟ ان کے بدن ڈھانکنے کے لئے کپڑا کہاں سے آئے؟

یہی سوچتے ہوئے وہ کناٹ پلیس میں پٹری پٹری چلا جا رہا تھا کہ بھگوان نے اس کے لئے ایک بڑی خوبصورت دھوتی آکاش سے بھیج دی، لال، نیلے، سفید رنگوں کا ایک کپڑا ٹھیک رامو کے اوپر گرا ــــ پہلے تو رامو اس میں الجھ کر گھبرایا پھر اس نے اوپر نظر کی تو دیکھا ایسے ہی سینکڑوں کپڑے ہوا میں اڑ رہے ہیں۔ دکانوں پر لٹکے ہوئے ہیں۔ ستونوں پر لپٹے ہوئے ہیں۔ اس نے سوچا "ایک کم ہو گیا تو کون دیکھے گا۔ اور پھر یہ تو

بھگوان کی دین ہے "۔ دوپہر کا وقت تھا، زیادہ تر دکانوں کے دروازے بند تھے، سوائے ایک آدھ تانگے کے کوئی دور دور نہیں نظر آتا تھا، رامو نے جلدی جلدی لال نیلے کپڑے کو تہہ کیا اور اپنی دھوتی میں چھپا کر گھر سے آیا، اب اس کی بیوی اور بیٹی دونوں ٹھیکیدار صاحب کے یہاں جا کر اپنے حصے کی پوریاں اور لڈو لا سکیں گی۔

رامو نے ترکیب یہ سوچ کر نکالی کہ اپنی دھوتی (جو دراصل اس کی بیوی ہی کی تھی) تو بیوی کو دی۔ جوان بیٹی کو اس کے پھٹے کپڑوں پر ماں کے پھٹے چیتھڑے بھی پہنا دیئے اور کچھ نہ کچھ تن ڈھانکنے کا انتظام ہو ہی گیا۔ پھر خود اس نے لال نیلے کپڑے کو تہمد کی طرح باندھ لیا۔ کالے چکنے جسم پر رنگین تہمد بہار دینے لگا۔ خوش خوش تینوں گھر سے نکلے، ٹھیکیدار نہال سنگھ کے ہاں اب بھی پوریاں اور لڈو بٹ رہے تھے اگرچہ پوریاں ٹھنڈی ہو چکی تھیں اور لڈوؤں کا چورا رہ گیا تھا، رامو نے بیوی اور بیٹی دونوں کو حصہ دلوایا۔ اور گھر واپس چلا کہ اب ایک وقت تو ڈٹ کر کھانا کھائیں گے۔

پھر کناٹ پلیس سے ہو کر جا رہے تھے، کہ رامو کو ایک دکاندار نے ٹوکا۔

" ابے او! یہ جھنڈا کہاں سے اڑایا؟ "

" جھنڈا۔ اجی میں کیا جانوں کون سا جھنڈا؟ "

" کون سے جھنڈے کی دُم! یہ تہمد کی جگہ کیا باندھ رکھا ہے؟ "

"اجی یہ ! . . . . " رامو اتنا سہما ہوا تھا کہ آواز نہ نکلی تھی۔
"ارے یہ تو ہماری دکان کا جھنڈا ہے۔ کب سے تلاش کر رہے ہیں ؟"
"کیا مزے میں مٹکائے جا رہا ہے !"
"چھین لو سالے سے"۔
"مارو سالے کو"۔
"بلاؤ پولیس مین کو"
"او میاں جمعدار ادھر آنا !"
ابھی پولیس کانسٹبل قریب نہ آیا تھا کہ ایک بگڑے دل نوجوان نے ہاتھ بڑھا کر جھٹکا مارا تو جھنڈا ہاتھ میں آگیا اور رامو سڑک پر مادر زاد ننگا کھڑا رہ گیا، اس کی بیوی کے منہ سے ایک چیخ نکل گئی اور اس نے شرم سے منہ موڑ لیا۔

"ہی ہی ہی ہی ہی۔ خی خی خی خی خی، ہا ہا ہا ہا ہا" چاروں طرف سے ہنسی اور قہقہے رامو پر اس طرح برسے کہ وہ زمین میں گڑ گیا۔
کسی راہ چلتے نے رحم کھا کر اس کو اپنی چادر دیدی کہ وہی باندھ لے رامو کی جان میں جان آئی مگر اس عرصے میں پولیس والے نے اس کو گرفتار کر لیا تھا، ہتھکڑی ڈال کر ساتھ لے چلا تو ایک خلقت ساتھ ہو گئی۔
"جھنڈا چور پکڑا گیا۔ سالا جھنڈا چور"۔
"ارے بھائی اس آدمی کو کیوں پکڑے لئے جا رہے ہو ؟ کیا

کیا اس نے ——؟" کسی نو وارد نے سپاہی سے پوچھا۔

"اجی ایک جرم کیا ہو تو بتائیں —— تین تین جرم"۔ بھیڑ میں سے ایک صاحب بولے جو قانون کے بڑے ماہر معلوم ہوتے تھے۔

"تین جرم! وہ کیا؟"

"پہلا جرم چوری"

"اور دوسرا؟"

"شاہی جھنڈے کی توہین"

"اور تیسرا؟"

"وہ یہ کہ ابھی سر بازار ننگا کھڑا تھا، یہ بھی قانون کے خلاف ہے" اور اوپر ہوا میں کئی سو جھنڈے ہوا میں پھرپھرا رہے تھے، گویا ہنس رہے ہوں"

۶۴ پہچان

"تم ہندوستانی نائیں ہو"

بار بار نشے میں مدہوش ٹامی یہی ... کہے جا رہے تھا۔

"تم ہندوستانی نائیں ہو! تم ہندوستانی نائیں ہو سکتے!"

حمید نے پھر کہا "مگر دس دفعہ کہہ دیا کہ میں ہوں ہندوستانی"

"نائیں۔ نائیں۔ تم ہندوستانی نائیں ہو سکتے"

شرابی سے بحث کرنا بے کار ہے۔ مگر حمید نے جل کر کہا "مگر کیوں؟

کوئی وجہ بھی تو ہو ؟"

ٹامی بولا "گڈ برادر، سنو بھائی۔ میں نشے میں ضرور ہوں۔ مگر بالکل مدہوش نہیں ہوں۔ آدھ گھنٹے سے اتنے آدمیوں کو گالیاں دے رہا ہوں، ٹھوکریں مار رہا ہوں، مگر ان میں سے ایک کی بھی ہمت نہ ہوئی، کہ مجھ سے سوال و جواب کرے اور تم نے آتے ہی میرے گریبان پر ہاتھ ڈال دیا۔ اگر یہ سب ہندستانی ہیں تو تم ہندوستانی نہیں ہو سکتے !"

"پھر وہی مرغے کی ایک ٹانگ !"

حمید چرچ گیٹ اسٹیشن سے شام کو پانچ بجے کے قریب نکلا تو اس نے دیکھا کہ بھیڑ لگی ہے سینکڑوں آدمی گھیرا ڈالے کھڑے ہیں، اور بیچ میں ایک ٹامی ــــ کبھی وہ فحش گالیاں بکتا ہے، کبھی لوگوں کو مارنے دوڑتا ہے، کبھی للکار کر کہتا ہے، کس میں ہمت ہے کہ مجھ سے مقابلہ کرے، اور سب لوگ سہمے ہوئے کھڑے تماشہ دیکھ رہے ہیں، کوئی کچھ نہیں کہتا۔ ایک اخبار بیچنے والا لڑکا گذرا تو ٹامی نے اس کو دھکا دے کر اس کے اخبار چھین لئے۔ اور ورقہ ورقہ کرکے ان کو ہوا میں اڑا دیا۔ وہ بے چارہ روتا ہوا بھاگا تو ایک چبوترے والے کا خونچہ الٹ دیا۔ کچھ دیر تو حمید یہ نظارا دیکھتا رہا۔ مگر جب ٹامی نے ایک بوڑھے راہ گیر کو پکڑ کر اس کو ایک طمانچہ مارا تو اس سے نہ رہا گیا۔ اور مجمع کو چیرتا ہوا وہ ٹامی کے پاس پہنچا۔

"ان بڑے میاں کو چھوڑ دو" اس نے ڈپٹ کر کہا۔
ٹامی نے بڑے میاں کو چھوڑ دیا اور حمید کی طرف پلٹ پڑا۔ آستینیں چڑھاتے ہوئے بولا ـــ "لڑنا چاہتے ہو ؟"

حمید نے "گربہ کشتن روز اول" کے اصول پر عمل کرتے ہوئے اس کا جواب ایک زناٹے دار چانٹے سے دیا ـــ حمید کا ڈیل ڈول کچھ زیادہ نہیں ہے اور ٹامی بڑا لمبا چوڑا تھا، مگر پھر بھی وہ آستینیں چڑھا کر ٹامی سے مقابلہ کرنے کو تیار ہو گیا، اس کو یقین تھا کہ چانٹا کھا کر ٹامی زخمی شیر کی طرح اور بھی بپھر جائے گا مگر اس کے تعجب کی کوئی انتہا نہ رہی، جب چانٹے کا جواب چانٹے یا گھونسے یا لات سے دینے کے بجائے ٹامی اس کے گلے سے لپٹ گیا۔

"او ـــ تم تو ہمارا فرینڈ ہے۔ تم ہندستانی نہیں ہو سکتا!"
شرابیوں کو کوئی ایک فقرہ مل جائے تو اس کو اس طرح رگیدتے ہیں جیسے گراموفون کا ٹوٹا ہوا ریکارڈ، ایک ہی لفظ کو دہراتا رہتا ہے۔ دس پندرہ بار حمید کو اس کے ہندستانی نہ ہونے کا یقین دلانے کے بعد ٹامی نے کہا۔ "کم آن فرینڈ" "آؤ یار، آج وکٹری ڈے ہے۔ ہم تم کو شراب پلائے گا" اب حمید لاکھ بہانے بناتا ہے، مگر ٹامی نہیں مانتا، غرض جھگڑا رفع کرنے کے لئے حمید راضی ہو گیا اور دونوں نے ایک "بار" میں پہونچ کر وسکی کا ایک ایک پیگ آرڈر دیا۔
ایک پیگ سے دو۔ دو سے تین۔ تین سے چار۔ اور کچھ دیر میں

یہ تمیز کرنا مشکل ہو گیا کہ ٹامی اور حمید میں سے کون زیادہ مدہوش رہتا۔ مگر ٹامی کو اب بھی اس بات کی رٹ لگی ہوئی تھی کہ ـــ "تم ہندستانی نہیں ہو سکتا۔"

پانچواں پیگ آیا تو ٹامی نے گلاس اٹھا کر کہا "ہیراز ٹو وکٹری۔ آؤ فتح کی خوشی میں ایک جام اور پئیں۔"

حمید کا قوم پرستی کا جذبہ فوراً بیدار ہو گیا، نشہ سے لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں اس نے کہا۔ "ہرگز نہیں ـــ یہ فتح سفید چمڑے والوں کی ہے۔ ہماری فتح نہیں ہے۔ میں نہیں پیوں گا۔"

"او۔ تو تم گاندھی کے ماننے والے کانگرسی ہو!" ٹامی نے تعجب سے کہا اور پھر وہی مرغے کی ایک ٹانگ "نائیں نائیں تم ہندستانی نائیں ہو سکتے۔"

حمید نے گاندھی اور کانگرس کا نام سن کر نفرت سے کہا۔ "میں کانگریسی وانگریسی نہیں ہوں، اور گاندھی وہ تو برلا، ٹاٹا جیسے سرمایہ داروں کا زرخرید ہے۔"

"اوہ۔ تو کیا تم مسٹر جناح کی لیگ میں ہو؟"

"ہرگز نہیں ـــ جناح اور اس کی لیگ تو زمینداروں کے ہاتھ میں ہیں، اور میں ایسے رجعت پسندوں اور ٹوڈیوں کا ساتھ دوں۔ ہونہہ!"

"تو تم ضرور کمیونسٹ ہو؟"

"یہ کمیونسٹ بھی بس نام ہی کے ہیں۔" حمید نے جواب دیا۔

"سب کے سب گورنمنٹ سے ملے ہوئے ہیں۔"

"بہت اچھا! بہت اچھا!" ٹامی چلایا "گورنمنٹ خراب بہت خراب۔"

اب حمید پر نشہ اور چڑھ چکا تھا —— بولا "کانگریسی، لیگی، سوشلسٹ، کمیونسٹ، یہ سب بکواس کرتے ہیں، آزادی آزادی چلا کر ہمیں غلام رکھتے ہیں۔ سمجھے غلام —— ! میں چاہتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں ......"

"تم کیا چاہتے ہو، دوست؟" ٹامی نے بڑی دلچسپی سے پوچھا۔

"میں انقلاب چاہتا ہوں، انقلاب۔ تمام ملک میں آگ لگانا چاہتا ہوں......" حمید کی نشہ بھری آواز سن کر بار میں جتنے لوگ تھے سب چونک پڑے، اور پھر وہ رازدارانہ لہجے میں بولا۔ جانتے ہو ہم پر قبضہ اس فوج کے ذریعہ کیا گیا ہے، اگر یہ فوج نہ ہوتی تو ہم آزاد ہوتے، سب سے پہلے اس فوج کو ختم کیا جائے گا۔"

"شاباش دوست شاباش" ٹامی چلایا۔ پھر کھڑا ہو کر "لیڈیز اینڈ جنٹلمین، ہیراز ٹو ریولیوشن! انقلاب کے نام پر ایک جام چڑھا دو!" اور پھر حمید سے "آؤ دوست چلو ہم ابھی آگ لگائیں گے۔ مگر کہاں سے شروع کریں۔ گورنمنٹ ہاؤس؟ تاج؟ —— میں کہتا ہوں سامنے ہائی کورٹ میں آگ لگائیں، آؤ چلو۔ جلدی کرو! انقلاب ہمارا انتظار کر رہا ہے۔"

"مگر مجھے جانا ہے۔ کام پر!" حمید نے گھبرا کر کہا۔ نشہ کا اثر کچھ اترتا جا رہا تھا۔

"کام پر؟ کس کام پر؟" ٹامی نے سوال کیا۔ "اور انقلاب کا کیا ہوگا؟"

حمید نے چڑھ کر کہا "میں کیا جانوں۔ مجھے ملٹری سپلائی کے ایک افسر سے ملنے جانا ہے۔ دیر ہوگئی تو ممکن ہے ٹھیکہ ہی نہ ملے۔"

ٹامی زور شور سے چلّایا "شاباش۔ تم ضرور ہندوستانی ہو۔ ہم بالکل پہچان گیا، ایک دم!" اور پھر وہی مرغے کی ایک ٹانگ "تم ہندوستانی نائیں ہو سکتا۔"

۵۔ اندھیرا

آکاش پر اندھیرا اتنا ہی گہرا چھایا ہوا تھا جتنا قیدی کے من میں۔ چاروں طرف اسے دنیا اندھیر نظر آتی تھی۔ کسی طرف بھی تو روشنی کی کرن نہ تھی۔ تین برس اس نے اس کال کوٹھری میں اپنے اندرونی شعلہ کی روشنی میں گذارے تھے، لیکن یہ شعلہ مدھم پڑتے پڑتے اب بالکل بجھ گیا تھا، اب تو دل کی تہہ میں راکھ بھی ٹھنڈی ہو چکی تھی۔

پھر اب جینے سے حاصل؟ کچھ نہیں —— اس نے طے کر لیا تھا کہ آج وہ اپنی زندگی کا خاتمہ کر دے گا۔ اب اس میں دس سال اور ایڑیاں

رگڑ رگڑ کر جینے کی ہمت نہ تھی، ہاں وہ آج ہی خودکشی کرے گا۔

کوٹھری میں چھت کے نزدیک ایک روشن دان تھا جس میں موٹی موٹی لوہے کی سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔ قیدی نے اپنی دھوتی کو بل دیکر رسی کی طرح مضبوط بنا لیا اور ایک سِرا اُس روشندان کی سلاخوں میں سے گرا کر دوسری طرف ایک پھندا بنا لیا تھا۔ بس اب چند لمحے کی دیر ہے، وہ اسٹول پر کھڑا ہو کر پھندا اپنے گلے میں ڈال لے گا۔ اور پھر اسٹول کو لات مار کر پھینک دے گا ـــــ ایک جھٹکا اور کام تمام ہو جائے گا۔

"ہاں اب اس کے سوا کوئی دوسرا چارہ نہیں" اس نے پھندے کو مضبوط کرتے ہوئے سوچا کہ جب وہ اگست ۴۲ء میں گرفتار ہوا تھا تو اس کو چودہ برس قید کی سزا نداق معلوم ہوئی تھی، اس کو یقین تھا کہ چند ماہ میں انقلاب کامیاب ہو جائے گا۔ اور پھر وہ رہا ہو جائے گا۔ مگر بجائے انقلاب ہونے کے سرکاری تشدد کامیاب ہوا تھا خیر آزادی کی جنگ میں ہار جیت ہوتی رہتی ہے۔ لیکن اس کا دل تو اس وقت ٹوٹا جب اسے معلوم ہوا کہ ملک میں ایسے لوگ بھی ہیں جو اس کو اور اس کے ساتھیوں کو سرفروش بہادر سمجھنے کے بجائے، وطن فروش اور غدار سمجھتے ہیں۔ کیا انھوں نے اسی لئے دیش اور آزادی کے لئے اپنی جان کی بازی لگائی تھی۔ ان پر فاشزم کا پانچواں دستہ ہونے کا الزام لگایا جائیگا؟ یہ گھاؤ بھی اس نے سہا تھا۔ کیونکہ اس کا خیال تھا کہ کبھی بھی قوم کی عدالت کے سامنے یہ معاملہ صاف ہو جائے گا، مگر خود قوم کی حالت کیا تھی؟

جیل میں خبریں بہت دیر سے پہنچتی تھیں، مگر جب آتی تھیں تو ان سے ہمت بندھنے کے بجائے ہمت ٹوٹ جاتی تھی۔ چاروں طرف غریبی کال، بیماری اور ان سب سے بڑھ کر موت سے بھی زیادہ خطرناک جمود بے ہمتی۔ بنگال میں لاکھوں انسان ایک ایک دانے کو ترستے ہوئے مر گئے۔ اور قوم کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔ ہزاروں عورتوں نے اپنی لاج ایک وقت کے کھانے کے عوض بیچ ڈالی اور کسی ماں کے لال کی رگ حمیت جوش میں نہ آئی۔ مانا کر لیڈر جیل میں تھے، لیکن جو باہر تھے وہ کیا کر رہے تھے؟ وہ کیوں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے تھے؟ کال، بیماری، اور سب سے بڑی بیماری آپس کی پھوٹ ..... ہندو اور مسلمان، کانگریس اور لیگ، اور مہاسبھا ایک دوسرے سے دست و گریبان، اور غیر ملکی حکمران اپنے محلوں میں مسرور مست، اور انسانوں کے خون کی ہولی کھیلتے ہوئے اناج چور۔ ٹھیکے دار سرمایہ دار اناج چور، کپڑا چور، نہ زندگی میں کھانا، نہ مرنے کے بعد کفن ہی میسر ان رے جمود۔ ان رے تعطل۔ تمام دنیا بیدار ہو رہی تھی۔ آگے بڑھ رہی تھی۔ مگر ہندوستان سو رہا تھا۔ افیم کے نشہ میں تھا۔ غلامی کی افیم کے نشہ میں۔ تمام یورپ میں جمہوریت اور آزادی کی قوتیں ابھر رہی تھیں چھوٹے چھوٹے ملک انقلابی نعروں سے بیدار ہو رہے تھے، تخت و تاج خاک میں مل رہے تھے، ظالم حکمرانوں کے قلعے متزلزل ہو رہے تھے مگر ٹس سے مس نہ ہوا تو ہندوستان۔ خبر آئی کہ گاندھی جی اور مسٹر جناح مل رہے ہیں۔ ممکن ہے کہ کانگریس اور لیگ کا سمجھوتا ہو جائے۔ ممکن ہے

دونوں مل کر جمہود اور ظلم و سامراج کا مقابلہ کریں، قیدی کی تاریک دنیا میں روشنی کی ایک ہلکی سی کرن آئی، اور پھر وہ غائب ہوگئی، اس کا دل ڈوب گیا، اس کی ہمت پست ہوتی گئی، وہ چار باجیل گیا تھا۔ عمر کے تیس سالوں میں سے دس سال قید میں گذارے تھے۔ وہ نہ کال کوٹھری سے ڈرا نہ کوڑوں سے۔ اس کو دق ہوگئی تھی، دن رات خون تھوکتے گذرتے تھے۔ پھر بھی اس نے زندگی سے منہ نہ موڑا تھا۔ مگر اس وقت اسے اپنے ملک والوں سے امید تھی۔ اب وہ امید ہی نہ رہی تھی۔ جینے کا ظلم اور سختی برداشت کرنے کا، سہارا ہی نہ رہا تھا۔ اب جیئے تو کیونکر ــــ؟ کس امید پر ــــ؟ کس سہارے پر؟

"بس اب آخری فیصلے کا وقت آگیا ہے!" اس نے سوچا اور اسٹول پر کھڑا ہوگیا۔ پھندا اپنے گلے میں ڈالا۔

دور سے آوازیں آرہی تھیں یا یہ اس کے حواس کا دھوکا تھا؟ نہیں آوازیں ہی تھیں ــــ کچھ لوگ چلا رہے تھے۔ کیا کہہ رہے تھے؟ "یورپ میں جنگ کا خاتمہ!" ــــ "روسی فوجیں برلن میں" ــــ "جرمن فوج نے ہار مان لی" ــــ "فتح کا دن!" ــــ "فتح کا دن!"

قیدی پاگلوں کی طرح ہنسنے لگا۔ "فتح کا دن؟ پاگلو! کس کی فتح کا دن؟ ہماری فتح کا دن تو اتنا ہی دور ہے جتنا پہلے تھا۔ اور دفعتاً اس کے دماغ میں خیال آیا کہ آج فتح کے دن اس کی موت نہایت

باموقع ہوگی۔ فتح کا دن ! اور ایک ہندوستانی قیدی کے گلے میں پھانسی کا پھندا ! ـــــ آج وہ زندگی پر فتح پاکر موت سے ہم آغوش ہوگا۔ موت ۔ موت ! موت ! اور پھر وہ مجنونانہ وار ہنسنے لگا۔ اور اس کے خوفناک قہقہوں کی آواز جیل کی دیواروں سے ٹکرا ٹکرا فضا میں پھیل گئی۔

وہ اسٹول کو ٹھوکر مار کر ہٹانے ہی والا تھا، کہ اس کو روشندان میں سے دور کچھ روشنی نظر آئی۔ شاید کچھ لوگ مشعلیں لئے چلے آرہے تھے، "فتح کے جشن میں گورنمنٹ نے کوئی جلوس نکالا ہوگا" اس نے سوچا۔ یہ بھی اچھا ہوا، یہ لوگ جب جیل کی دیوار کے نیچے سے گزریں گے تو میں چلّا کر کہوں گا۔ "آؤ بھائیو ! اور دیکھو میں کس طرح زندگی پر فتح پاتا ہوں" مگر نہیں، یہ سرکاری جلوس نہیں ہوسکتا، بھلا سرکاری جلوس اور "انقلاب زندہ باد کے نعرے" اب جلوس قریب آتا جارہا تھا۔ نعرے صاف سنائی دے رہے تھے۔ "لال جھنڈے کی جے" "انقلاب زندہ باد"۔ "سوویت روس زندہ باد" لال فوج زندہ باد" ـــــ مزدوروں کا جلوس تھا۔ جوشیلی آوازیں۔ مشعلوں کے شعلوں کی طرح آسمان کی طرف لپک رہی تھیں۔ اور پھر آوازیں آئیں "ہندستان آزاد ہو" ہندستان آزاد ہو" "ہمارے لیڈروں کو رہا کرو"۔ "ہمارے ساتھیوں کو رہا کرو" ـــــ اور پھر وہ نعرہ جواب بھی قیدی کی روح کو تڑپانے کے لیے، اس کی ٹھنڈی رگوں میں گرمی پہونچانے کے لئے کافی تھا۔

"انقلاب زندہ باد" ـــ "انقلاب زندہ باد"

جلوس گذر گیا مگر نعرے، قیدی کے دماغ میں گونجتے رہے اور فتح کے دن کا ایک نیا نقشہ اس کے دماغ میں بنتا گیا، یہ جرنیلوں، بادشاہوں، حکمرانوں کی فتح نہیں تھی۔ یہ یورپ کے عوام کی فتح تھی۔ یہ جنتا کی فتح تھی۔ یہ یونان، یوگوسلاویہ کے گوریلا چھاپہ ماروں کی فتح تھی یہ فرانس کے طالب علموں کی فتح تھی، جنھوں نے ہٹلر کے ظلم کا مقابلہ کیا تھا۔ یہ روس کے کروروں مزدوروں اور کسانوں کی فتح تھی جنھوں نے اپنی جان دے کر نازی ازم کے بڑھتے ہوئے سیلاب کا منہ موڑ دیا تھا اور جنھوں نے دوسرے ملکوں کے یہاں تک کہ ہندستان کے مزدوروں اور کسانوں کے دل ہمت سے بھر دیئے تھے۔

دنیا کی تاریخ میں ہٹلر سے زیادہ فوجی طاقت کسی بادشاہ، کسی شہنشاہ، کسی حکمران کے پاس نہ ہوئی تھی۔ اور پھر اس طاقت کے سامنے جھکنا پڑا تھا۔ ہٹلر کا غرور خاک میں مل گیا تھا۔ تو دوسرے ہٹلر ـــ چھوٹے ہٹلر ـــ کب تک اپنی خیر منائیں گے، غلامی اور ظلم کی اندھیری رات آخرکار ڈھل رہی تھی۔

نندی نے اپنے گلے سے پھانسی کا پھندا اتار لیا، اور روشندان کا سہارا لے کر کھڑا ہو گیا۔ اجالے کے انتظار میں۔

میں اور وہ

بارش دن بھر برستے برستے تھک سی گئی تھی، میں دفتر سے نکلا تو سڑک پر ایک ایک انچ پانی کھڑا تھا۔ جو بہت جلد پھٹے ہوئے تلے میں سے ہوتا ہوا جوتے کے اندر پہنچ گیا۔ مگر یہی غنیمت تھا کہ پانی اوپر سے نہیں پڑ رہا تھا، گو کالے کالے بادل اب بھی چھائے ہوئے تھے ایک ہاتھ میں تھیلے کو اور دوسرے میں چھتری کو سنبھالتے ہوئے میں نے جلد جلد بس سٹینڈ کی طرف قدم بڑھائے کہ شاید کوئی ... جانے والی بس مل جائے۔

چھتری !! جس چیز کو میں چھتری کہہ رہا ہوں وہ کسی زمانے میں واقعی چھتری ہی تھی اب بھی دور سے چھتری ہی معلوم ہوتی ہے کیونکہ لپٹے ہوئے کالے کپڑے میں سے ایک ٹوٹی ہوئی موٹھ باہر نکلی ہوئی ہے ہاں کھلنے پر یہ چھتری چھلنی بن جاتی ہے۔ کیونکہ بارش کا پانی اس میں کئی جگہ سے قطرہ قطرہ کرکے ٹپکتا ہے۔ مگر صرف پانی۔ صاف ستھرا نتھرا ہوا پانی۔ کوئی کچرہ وغیرہ نہیں۔ یعنی یہ چھلنی بھی ہے اور فلٹر بھی۔ درختوں کے پتے۔ درختوں میں بیٹھنے والے پرندوں کی بیٹ۔ دوسری تیسری منزل کی کسی کھڑکی سے پھینکے ہوئے ترکاری کے چھلکے۔ سگریٹ۔ یا اس قسم کا کوئی کوڑا کباڑ کبھی اس چھتری کے سوراخوں میں سے گذر کر نہیں جا سکتا تھا۔ اس لئے جب بارش کے دن نہیں ہوتے میں بمبئی کی بعض سڑکوں پر گذرتے ہوئے ہمیشہ یہ چھتری کھول کر سر کے اوپر کر لیتا ہوں کہ "خدا محفوظ رکھے ہر بلا سے" جو آسمان کی طرف سے انسان کے سر پر نازل ہوتی ہے! ہاں بارش کی اور بات ہے ...... تو ہر چیز دنیا میں ہر کام تو نہیں دے سکتی۔ یہ کیا ضروری ہے کہ جو چھتری کچرے کو روکنے کے لئے بنائی گئی ہو وہ بارش میں بھی کام آئے۔ اس کے علاوہ سنا ہے کہ سمندر میں سے جب بھاپ اٹھتی ہے، تو کبھی کبھی مچھلیاں بھی بادلوں میں کھنچی چلی جاتی ہیں۔ اور پھر پانی کے ساتھ مچھلیوں کی بارش بھی ہوتی ہے۔ اگر کبھی ایسا حادثہ پیش آیا تو میری چھتری آڑے وقت ضرور کام آئیگی۔

کیونکہ چھوٹی سے چھوٹی مچھلی بھی اس کے بڑے سے بڑے سوراخ میں سے نہیں گذر سکتی۔

آپ کہیں گے اس چھوٹی سی کہانی میں ایک پرانی ٹوٹی ہوئی چھتری کا اتنا لمبا ذکر کیوں۔ تو بات یہ ہے کہ اس کہانی کی ہیروئن یہ چھتری ہی ہے، یا ہیرو کہہ لیجئے کیونکہ ہیروئن تو ایک اور ہے یا یوں سمجھ لیجئے کہ اس کہانی میں ایک ہیرو اور ایک ہیروئن کے بجائے دو ہیروئنیں ہیں ایک تو یہ چھتری اور ایک وہ! رہا میں، تو میری وہی حالت ہے، جو دو عورتوں کے درمیان ایک شریف آدمی کی ہو سکتی ہے۔ میں نے اپنے کو شریف آدمی کہا، اسے میری تعلّی نہ سمجھئے۔ بلکہ میری بدقسمتی سمجھئے جی ہاں! میری سب سے بڑی بدقسمتی یہی ہے کہ شریف ہوں۔ جبھی تو پانچ بار گدلے کھانے کے بعد بھی بی۔ اے پاس نہ کر سکا۔ چار سال سے اخبار کے دفتر میں پروف ریڈر ہوں چالیس روپے تنخواہ ملتی ہے۔ مگر آج تک مالک سے تنخواہ بڑھانے کی درخواست نہیں۔ شرافت مانع ہوتی ہے۔ پریس کے منیجر۔ فورمین۔ ہیڈ پروف ریڈر۔ یہاں تک کہ دوسرے پروف ریڈروں کی جھڑکیاں سن لیتا ہوں۔ مگر جواب نہیں دیتا۔ شریف ہوں نا! ایک دن ایک شرابی ٹامی نے راہ چلتے یونہی مذاق مذاق میں ایک طمانچہ رسید کر دیا۔ میں نے سوچا میں بھی یونہی مذاق مذاق میں ایک ہاتھ جھاڑ دوں۔ مگر فوراً شرافت نے کہا۔ چھوڑو بھی کیوں رذیلوں کے منہ لگتے ہو۔

اور یہ ہے میری شرافت کی داستان! پینتیس برس کی عمر ہونے کو آئی۔ آج تک شادی نہیں کی۔ چالیس روپے ماہوار پر کیا خود کھاؤں اور کیا بیوی کو کھلاؤں۔ ایک کمرے میں تین اور غیر شادی شدہ لوگوں کے ساتھ رہتا ہوں۔ شادی کر دوں تو بیوی کو کہاں رکھوں۔ اور پاس نہ رکھوں تو شادی کیوں کروں؟ میرے تینوں ساتھی باقاعدگی سے ہر مہینے ایک بار پہلی تاریخ کی رات کو فورس روڈ جاتے ہیں۔ اور پھر اگلے مہینے کی پہلی تاریخ کا انتظار کرتے ہیں، اس دن پہلی تاریخ تھی، اور میں جانتا تھا، کہ آج وہ تینوں آدھی رات کو گھر واپس آئینگے میری جیب میں بٹوہ تھا، اور بٹوے میں دو تین روپے کی ریزگاری کے علاوہ دس دس روپے کے چار کرارے نوٹ تھے، .... میں بھی ان کی طرح اس مصرف کے لئے ایک روپیہ۔ دو روپے۔ پانچ روپے تک خرچ کر سکتا ہوں۔ مگر میں ان کے ساتھ ایک بار بھی نہیں گیا۔ ..... میں نے کہا نہیں کہ میں شریف ہوں! اور میری چھتری میں چاہے سوراخ ہوں مگر میری شرافت میں نہیں۔

"بھاڑ میں جاؤ تم اور تمہاری چھتری اور تمہاری شرافت!" آپ دل میں ضرور کہہ رہے ہوں گے۔ "وہ کہاں ہے وہ۔ کہانی کی ہیروئن!" معاف کیجئے آپ کو انتظار کرنا پڑا۔ مگر فلم دیکھتے ہیں تو آپ کو ضرور معلوم ہوگا کہ کامیاب فلم ڈائرکٹر کافی انتظار کرانے اور اشتیاق بڑھانے کے بعد ہی پہلے ریل کے ختم یا دوسرے ریل کے

شروع میں ہیروئن کو پر دے پر لاتے ہیں۔ آپ نے تو انتظار کے چند منٹ ہی گذارے ہیں اس شام کو مجھے تو بس سٹینڈ پر آدھ گھنٹے سے بھی زیادہ کھڑا رہنا پڑا۔ نہ بس آئی اور نہ وہ!.... یہاں تک کہ سڑک کی بتیاں روشن ہو گئیں۔ اور دوسرے مسافر جو بس کا انتظار کر رہے تھے تنگ آ کر ٹرام میں بیٹھ کر چلے گئے میں اکیلا آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر آنے والی بس کی روشنی کو تلاش کر رہا تھا، کہ میری ناک نے مجھے بتایا کہ وہ آ گئی۔ میری آنکھوں نے اسے آتے نہ دیکھا۔ میرے کانوں نے اس کی آہٹ نہ سنی مگر میری ناک نے اس کی خوشبو سونگھ لی۔ دھیمی دھیمی تیز تیز خوشبو جو ولایتی عطر، پاؤڈر، پسینے اور بارش کی بوندوں سے مل کر بنا رہی ہے، میں نے سر گھما کر دیکھا تو اس کو برابر کھڑا پایا۔ ہاتھ میں ایک ہرے رنگ کا بیگ اور بس! نہ چھتری نہ برساتی ..... وہ آئی ہی تھی بس بھی آ گئی۔ دو درجے کی بس۔ اوپر کا درجہ بغیر چھت کا اور نیچے کا کھچا کھچ بھرا ہوا وہ کیونکہ میرے پیچھے تھی، میں قدم ہٹا کر پیچھے ہٹ گیا، کہ اگر صرف ایک ہی جگہ ہو تو اسے مل جائے۔ میں دوسری بس کا انتظار کر لوں گا....

میں نے عرض کیا تھا نا کہ میں شریف ہوں۔

مگر میری قربانی بے کار ثابت ہوئی۔ کنڈکٹر نے کہا "اوپر کی بس خالی پڑی ہے۔ جو مسافر چڑھے گا۔ اس کو اوپر جانا پڑیگا۔"

دوسرے مسافر بارش کے ڈر سے زینے کے پاس دبکے ہوئے چپکے ہوئے کھڑے تھے۔ مگر اس نے پروا نہ کی اور کھٹ کھٹ کرتی ہوئی اوپر چلی گئی۔ اور پیچھے پیچھے میں بھی۔ کنڈکٹر نے ٹھیک کہا تھا۔ اوپر ایک مسافر نہ تھا، صرف میں اور وہ۔ وہ سیدھے ہاتھ کی بنچ پر بیٹھ گئی اور میں اس کے قریب ہی بائیں ہاتھ کی بنچ پر۔ کنڈکٹر آیا۔ میں نے شیواجی پارک کا ٹکٹ لیا۔ اس نے ماہم کا۔ نہ جانے کیوں مجھے یہ اچھا معلوم ہوا کہ وہ بھی اتنی دور جانے والی ہے۔ اس کے بعد کنڈکٹر نہ جانے کہاں غائب ہوگیا۔ پیچھے کسی سیٹ پر بیٹھ گیا؟ نیچے چلا گیا؟ یا ہوا میں غائب ہوگیا۔ مگر راستہ بھر میں نے پھر اسے نہ دیکھا۔

ابھی بس پوری بندر نہ پہنچی تھی کہ ایک موٹی سی بوند میرے گنجے سر پر آگری۔ میں نے سوچا گنجے ہونے میں بھی کتنے فائدے ہیں۔ آج اگر سر پر بالوں کا چھپر ہوتا تو جب تک شرابور نہ ہو جاتا پتہ بھی نہ چلتا کہ بارش ہو رہی ہے؟ اوپر نگاہ کی تو آسمان کو بالکل اندھیرا پایا جس پر چمکتے ہوئے بجلی اور ٹرام کے تاروں کا جال بچھا ہوا تھا، مگر وہ بوند اپنے قافلے سے چھٹک کر اکیلی ہی چلی آئی تھی۔ کیونکہ اس کا ساتھ دینے کو ایک بوند بھی اور نہ گری۔

بس ٹھہری تو کیپیٹل سینما کی روشنی میں میں نے اس کا

چہرہ پہلی بار دیکھا۔ گورا، گورا، گلابی، گلابی، یاقوتی ہونٹ، کتابی چہرے کے گرد سنہرے بالوں کا ہالہ۔ بالوں میں دو موٹی موٹی بوندیں اس طرح چمک رہی تھیں جیسے موتی پرو دیئے ہوں۔ میں نے دل میں سوچا " یہ میمیں بھی کتنی خوبصورت ہوتی ہیں "۔ مگر کیپٹل سینا کی روشنی شائد میرے چہرے پر بھی پڑی کیونکہ اس نے بھی ایک نگاہِ غلط انداز میری طرف ڈالی۔ اور کچھ ایسے انداز سے منہ پھیر لیا، گویا دل میں سوچا " یہ ہندوستانی بھی کتنے بدصورت ہوتے ہیں "۔ اور اس لمحے میں مجھے اپنے ٹوٹے ہوئے جوتے، پھٹے ہوئے کوٹ، پیوند لگے ہوئے قمیص۔ بغیر استری کی پتلون تین دن کی بڑھی ہوئی ڈاڑھی۔ گنجے سر اور سب سے زیادہ کالی رنگت کا احساس۔ اتنی شدت سے ہوا۔ کہ دوبارہ اس کی طرف دیکھنے کی ہمت نہ پڑی۔ مگر یہ احساس بہت جلد دماغ کے پچھلے کونے میں چلا گیا، جب چاند پر دو موٹی موٹی بوندیں پڑیں۔ ان دونوں کو شاید یہ چکنا چکنا کھیل کا میدان پسند آیا۔ اور انہوں نے اپنی بہنوں سہیلیوں بلکہ دور دراز کی رشتہ داروں اور محلہ والیوں کو بھی بلا وا بھیج دیا۔ بس کرا فورڈ مارکٹ نہ پہنچی تھی، کہ بارش باقاعدہ شروع ہو گئی۔

مگر مجھے اپنے بھیگنے کی اتنی فکر نہ تھی جتنی اس کی!

مانا کہ اس نے میری طرف نفرت سے دیکھا تھا، مگر پھر بھی وہ عورت

تھی اور وہ بھی خوبصورت عورت اور کم سے کم اس وقت تو وہ بھی میری طرح مصیبت زدہ تھی، میں نے اس کی طرف نظر کی تو اسے اپنی طرف دیکھتے پایا، اور اس بار اس کی آنکھوں میں وہ پہلی جیسی نفرت نہ تھی، کیا یہ میری آنکھوں کا قصور تھا یا وہ واقعی میری طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔

"چھتری کیوں نہیں کھول لیتے؟" اس نے بڑے میٹھے لہجے میں کہا۔ اب میں اسے اپنی چھتری کا حال زار کیسے سناتا کہ یہ دکھاوے ہی دکھاوے کی ہے کام کی نہیں۔

"چھتری! اوہ چھتری؟" میں نے زنگ ہوئی کمانیوں کو کھولتے ہوئے جواب دیا۔ "خوب یاد دلایا آپ نے شکریہ" گویا میں کوئی فلسفہ کا پروفیسر تھا جو صرف بے خیالی کی وجہ سے اپنی پچیس روپے کی ریشمی کپڑے کی چھتری کھولنا بھول گیا ہو۔

بارش ہو رہی تھی، وہ بھیگ رہی تھی، میں چھتری یا تھیلی یا جو کچھ بھی کہئے لگائے بیٹھا تھا، کچھ نہ کچھ بچاؤ ہو ہی رہا تھا۔ "آئیے آپ بھی چھتری کے نیچے اس سیٹ پر بیٹھ جائیے" کئی بار میری زبان کی نوک پر یہ الفاظ آئے۔ مگر پھر میں رک گیا۔ کچھ جھجک، کچھ جھینپ، کچھ رعب حسن، کچھ یہ ڈر کہ شائد اس بے تکلفی پر ڈانٹ دے، آخر وہ میم ٹھیری اور میں ایک شریف آدمی۔ میں نے بس کے باہر کی طرف دیکھنا شروع کر دیا۔ گویا مجھے کسی

بھیگتی ہوئی عورت کی موجودگی کا علم ہی نہ تھا . . . . . اور پھر میری ناک نے مجھے بتایا کہ وہ اٹھ کر میری سیٹ پر آگئی ہے، اور دائیں گھٹنے پر ہلکے سے نرم سے لطیف سے دباؤ نے اس بات کی تصدیق کر دی۔

" آیئے، آیئے آپ آرام سے بیٹھئے " میں نے سرک کر لکڑی کی دیوار میں گھسنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے کہا اور چھتری اس کی طرف جھکا دی۔ جدھر سوراخ زیادہ تھے وہ حصہ میں نے اپنی طرف کر لیا۔ تاکہ میں بھیگوں یا بچوں مگر وہ محفوظ رہے۔

" بڑی مہربانی ہے آپ کی ؟" اس نے واقعی تشکرانہ لہجے میں کہا " آپ اپنی چھتری میں آسرا نہ دیتے تو میں تو بالکل ہی بھیگ جاتی "

اور میں نے سوچا " اے جانِ جہان ۔ یہ ٹوٹی ہوئی چھلنی نما چھتری کیا چیز ہے، اگر دس چھتریاں ہوتیں تو تم پر سے قربان تھیں، تمھارے لئے تو جان حاضر ہے "

باتوں کا سلسلہ چھڑ گیا " آپ کیا کام کرتے ہیں ؟ میں اخبار کے دفتر میں ہوں ۔ اس کا کوئی ذکر نہیں کہ ایڈیٹر ہوں یا پروف ریڈر آپ بھی کچھ کام کرتی ہیں کیا ؟ جی ہاں کام ہی سمجھئے۔ میں نے دل میں سوچا " بے چاری سٹینوگرافر ہوگی۔ دن بھر ٹائپ رائٹر پیٹ کر تھکی ہاری واپس جا رہی ہے . لوگ بھی خواہ مخواہ ان میموں کو بدنام کرتے ہیں، حالانکہ کتنے اخلاق سے پیش آ رہی ہے ! "

بارش اب موسلا دھار ہو رہی تھی، میں نے کہا "آپ کا ڈریس بھیگ جائے گا۔ یہ کینوس کا غلاف گھٹنوں پر ڈال لیجئے" چار گھٹنوں پر جب ایک غلاف ڈالا گیا۔ تو ٹکر لازمی تھی، بھیگی ہوئی گداز رانوں کے لمس کے ساتھ ایک بجلی کی سی رو بدن میں دوڑ گئی۔

میں نے اپنے ان تینوں دوستوں کا خیال کیا جو اس وقت فورس روڈ کی خاک بلکہ کہنا چاہیئے کیچڑ چھان رہے ہوں گے۔ اور میرا دل فخر اور خوشی سے بھر گیا۔ بدتمیز گندے کیڑے! گندی نالیوں میں مارے مارے پھرتے ہیں! اور تجھے دیکھو مجھے، میں ایک بس کی کھلی ہوئی چھت پر اپنی چھتری کے نیچے دنیا کی سب سے حسین لڑکی کو بغل میں دبائے بیٹھا ہوں۔

اب بارش کے ساتھ ساتھ ہوا کا جھکڑ بھی چلنے لگا۔ چھتری کا بس نہ چلتا تھا کہ پیراشوٹ بن کر مجھے اڑا کر لے جائے۔ میں پوری طاقت سے دائیں ہاتھ میں ٹوٹا ہوا ہنڈل اور بائیں ہاتھ سے فریم کو پکڑے ہوئے تھا، کہ کہیں ہوا کے زور سے الٹ نہ جائے۔ اتنے میں میں نے اپنے دائیں ہاتھ کے قریب ایک نرم ہاتھ کی قربت محسوس کی۔ چھتری کو قابو میں کرنے کے لئے وہ بھی میری مدد کر رہی تھی، اس کا دایاں ہاتھ میرے ہاتھ کے ساتھ ہینڈل پر تھا، اور بایاں میری کمر کے پیچھے سے ہوتا ہوا چھتری کے فریم کو سنبھالنے کی کوشش کر رہا تھا، اف کتنے کیف آور تھے

وہ لمحات !

میں شریف ضرور ہوں مگر میرا دل ذرا رومانی واقع ہوا ہے میں نے صورتِ حال پر غور کیا تو کتنی دلفریب نظر آئی۔ ایک مرد اور ایک عورت۔ ایک حسین عورت۔ ایک ہی چھتری کے سائے میں ایک دوسرے کے اتنے قریب، تقریباً ایک دوسرے سے لپٹے ہوئے۔ کسی شاعر کا شعر میرے دماغ میں بجلی کی طرح کوندا۔

لپٹ جاتے ہیں وہ بجلی کے ڈر سے
الٰہی یہ گھٹا دو دن تو برسے

مگر رومانی ہونے کے علاوہ مجھے پالٹیکس میں بھی دخل ہے، روزانہ اخبار کے پروف پڑھتا ہوں نا! آزادی! بین الاقوامی سیاست! اٹلانٹک چارٹر! سان فرانسسکو! پوٹسڈم! مجھے ان سب کے ہجے معلوم ہیں۔ میں نے ہزاروں سیاسی مضمونوں کے پروف پڑھ ڈالے ہیں، اس لئے میں (special correspondent) کی طرح ہر موسم میں پولیٹیکل معنی تلاش کر سکتا ہوں۔ مثلاً آج آسمان پر کالے بادل چھائے ہوئے ہیں۔ اس لئے گاندھی جی اور مسٹر جناح کی بات چیت کے بارے میں سیاسی حلقے مایوسی کا اظہار کر رہے ہیں، آج صبح سورج نے بادلوں میں سے منہ نکال کر جھانکا۔ جس سے خیال ہوتا ہے کہ شاید کانگریس اور لیگ

میں سمجھوتے کی کوئی صورت نکل آئے۔ ویول کانفرنس کے دوران
میں شملہ سے جو رپورٹیں آئی تھیں ان کے پروف پڑھتے پڑھتے
تو میں اس قسم کی موسم شناسی کا ماہر ہو گیا ہوں...... ہاں
تو اس وقت بھی میں نے اپنی اور اس لڑکی کی ان عجیب حالات
میں ملاقات پر غور کیا، کہ اسے کس پولٹیکل نکتہ کی ثابت
کیا جا سکتا ہے تو فوراً ہی میرے دماغ نے کہا " یہ تو بالکل ہی
کھلی ہوئی بات ہے، تو ہندوستان ہے مصیبت کا مارا ہندوستان
جس کی چھتری اور جوتے اور قسمت تینوں میں سوراخ ہیں، یہ لڑکی
برطانیہ ہے، جو اپنے حسن اور ناز و انداز کے زور سے ہندوستانیوں
کے دلوں پر حکومت کرتی ہے، یہ بارش اور طوفان، جنگ اور
فاشیت کا طوفان ہے اور یہ ٹوٹی ہوئی چھتری ہندوستان
کی بچی کھچی پونجی ہے جو ہندوستان اور انگلستان دونوں کو اس
طوفان سے بچانے کے لئے ضروری ہے ......
اب بس بھنڈی بازار سے گزر رہی تھی، ایک دوکان کے
اوپر کپڑے پر موٹے موٹے حرفوں پر لکھا ہوا نظر آیا " پاکستان یا
موت " بارش کا پانی پڑنے سے پاکستان کی داڑھی نکل آئی
تھی، اور موت پھیل کر اور بھی خوفناک ہو گئی تھی، میں نے دل
میں کہا میں موت سے ڈرتا ہوں۔ مجھے پاکستان ہی دے دو
اور پھر میرے اخباری دماغ نے کہا تو ہندوستان ہے اور یہ لڑکی

پاکستان ہے۔ اور یہ طوفان انگریزی سامراج ہے اور یہ چھتری ہمالیہ پہاڑ ہے، جس کی چھاؤں میں دونوں کو پناہ ملتی ہے، مگر نہیں نہیں یہ بے پردہ انگریز لڑکی پاکستان کیسے ہو سکتی ہے، اور میں ایک گائے کھانے والا مسلمان ہندوستان یا ہندوستانی کیسے ہو سکتا ہوں، اور یہ پھٹی ہوئی چھتری ہمالیہ پہاڑ کیسے ہو سکتی ہے ...... یہ پولیٹیکل تشبیہہ کچھ چلی نہیں ......

بارش اور طوفان کا زور کم ہو گیا تھا، اور وہ میرے کندھے پر سر رکھے سو رہی تھی، جیسے خوبصورت سی بلی خرخر کرتی ہوئی دبک کر سو جائے۔ لاحول ولا قوۃ میں بھی کیوں خواہ مخواہ سیاسی تشبیہوں کے جال میں پھنس گیا، ہم دونوں ہندوستان اور انگلستان۔ یا ہندوستان اور پاکستان کی علامت نہیں تھے۔ ہم علامت تھے محبت کی .... وہ ابدی اور محبت جو آدم و حوا سے لے کر آج تک مردوں اور عورتوں کو ایک دوسرے سے ملاتی آئی ہے، ہم دونوں لیلیٰ مجنوں تھے ..... ہم شیریں فرہاد تھے ...... اور .... اور ...... یہ دودھ کی نہر تھی جو چھتری کے ایک سوراخ میں سے گذر کر میرے کوٹ کے کالر میں سے ہوتی ہوئی میری ریڑھ کی ہڈی پر سے بہہ رہی تھی! ....

ہاں تو وہ میرے کندھے پر سر رکھے سو رہی تھی، اور میں ... تو وہ شاعر پہلے ہی بیان کر گیا ہے کہ۔

نینداس کی ہے دماغ اس کا ہے راتیں اس کی ہیں
جسکے شانوں پر تیری زلفیں پریشان ہوگئیں

اور اسی طرح بائیکلہ پریل اور داور گذر گئے۔ بارش تھم گئی اور بغیر اس کی نیند کو پریشان کئے میں نے چھتری بند کرکے رکھ لی، بس تلک برج پر سے گذر رہی تھی، کہ اس نے اپنی خمار آلود آنکھیں کھولیں۔ ایک انگڑائی لی۔ اور بولی "آپ کا بہت بہت شکریہ"۔ اور نہ جانے کیوں بہت بہت پر اتنا زور ..... اور میرے جی میں آئی کہ کہوں شکریہ تو مجھے ادا کرنا چاہئے۔ کیونکہ یہ میری زندگی سنہری لمحات تھے"۔ مگر ایسا کہنا بدتمیزی معلوم ہوا۔ اسلئے صرف یہ بڑبڑا کر رہ گیا۔ "جی نہیں اس میں شکریہ کی کیا بات ہے"۔ اب بس شیواجی پارک کے نکڑ پر مڑ رہی تھی، اور میرا دل بیٹھا جارہا تھا، کیونکہ ہری نواس پر مجھے اترنا تھا۔ لاکھ کوشش کی کہ ہمت کرکے اس کا پتہ پوچھ لوں۔ مگر اسی کمبخت خاندانی شرافت نے زبان پر قفل خاموشی لگادیا۔

"ہری نواس" نیچے سے کنڈکٹر چلایا، جونہی جھٹکے کے ساتھ بس ٹھیری میں ہڑبڑا کر اٹھا اپنی ٹوٹی ہوئی چھتری اٹھائی۔

"گڈ نائٹ" اس نے مسکرا کر خدا حافظ کہا۔ اب اس کے دانت کتنے چمکدار تھے۔

"گوڈ نائٹ" میں نے بادل نخواستہ کہا اور آخری نظر اس کے

شاداب چہرے پر ڈال کر نیچے اتر آیا۔
سامنے ایرانی کے ہوٹل میں روشنیاں جگمگا رہی تھیں، گھر جانے کو میرا جی نہ چاہا۔ سوچا ایک پیالی پی لوں پھر جاؤں گا۔ چائے گرم نہ تھی، ایک گھونٹ میں پی گیا۔ چھتری سنبھالی۔ اور چلنے لگا۔
"او مسٹر، پیسے تو دیتے جائیے" بیرے نے آواز دی۔
لاحول ولاقوۃ، میں بھی کس خیال میں مدہوش ہوں کہ دام دیئے بغیر ہی جا رہا تھا۔ اور یہ بیرا سمجھتا ہوگا کہ میں کوئی اٹھائی گیرا ہوں۔ میں نے طے کر لیا کہ اس کو ایک آنہ انعام دوں گا۔ تاکہ اس کو معلوم ہو جائے کہ میں کوئی ایسا ویسا نہیں ہوں۔ اس کے علاوہ آج کی رات ایک یادگار رات تھی، اس خوشی میں...... میرا ہاتھ کوٹ کی اندر کی جیب میں تھا، مگر وہاں بٹوہ نہ تھا، بٹوہ کسی جیب میں بھی نہ تھا، میرے کانوں میں ایک میٹھی آواز آئی "آپ کا بہت بہت شکریہ" اور نہ جانے کیوں بہت بہت پر زور!
ایک ٹیکسی والا برابر میں بیٹھا چائے پی رہا تھا، سامنے سڑک کے کنارے اس کی ٹیکسی کھڑی تھی۔ میں نے سوچا اگر میں چاہوں تو اس ٹیکسی میں بیٹھ کر اس بس کو ماہم پہنچنے سے پہلے پکڑ سکتا ہوں۔ اس لڑکی کو گرفتار کرا کے اپنا بٹوہ۔ اپنے چالیس روپے اپنے گاڑھے پسینے کی کمائی واپس لے سکتا ہوں۔ مگر میں نے اس میں سے کچھ بھی نہ کیا۔ کیوں؟ اس لئے کہ..... اس لئے کہ...... آخر

وہ انگریز مجھیری اور میں ایک شریف آدمی ..... میں نے آپ سے
کہا نہیں تھا کہ شرافت ہی میری سب سے بڑی بد قسمتی ہے ....

موت کی شکست

ایک بچّہ

زندگی اور موت !

مقابلہ سخت تھا !

موت لشکر کے لشکر ساتھ لے کر آئی تھی۔ کمزوری۔ بیماری خون کی کمی۔ گہرا زخم۔ زہریلا مادّہ۔ نو برس کا بچّہ۔ غریب بچّہ۔ کبھی اس کو پیٹ بھر کر کھانا نصیب ہی نہیں ہوا تھا۔ چند مہینے ہی کا

تھا کہ باپ مرگیا۔ ماں نے دوسری شادی کر لی۔ سوتیلا باپ شرابی تھا اور بدمزاج۔ جب رات کو نشہ میں چور آتا تو بیوی اور سوتیلے لڑکے دونوں کو مارتا۔ تھپڑ، لکڑی، جوتا جو بھی ہاتھ آ گیا۔ ایک دن صبر کا پیمانہ چھلک گیا۔ اگلے دن سورج نکلنے سے پہلے ہی بچہ گھر سے بھاگ نکلا۔

اس وقت اس کی عمر سات برس کی تھی۔

دو سال تک وہ مارا مارا پھرتا رہا۔ اخبار بیچے۔ جوتوں پر پالش کیا۔ برتن دھوئے۔ نالیاں صاف کیں۔ بوجھ ڈھویا۔ بھیک مانگی۔

اس کا رنگ کالا تھا۔ اس کے باپ کا رنگ بھی کالا تھا۔ اور ماں کا بھی۔ اس کو معلوم تھا کہ کالے ماں باپ کے بچے ہمیشہ کالے ہوتے ہیں۔ مگر پھر بھی وہ اکثر سوچتا۔ کاش میرا رنگ کالا نہ ہوتا۔ معلوم ہوتا ہے کہ کالے آدمیوں کو خدا نے گوروں کی خدمت کرنے، ان کی گالیاں اور ٹھوکریں کھانے کے لئے ہی بنایا ہے۔ نہ جانے ان سب کالوں نے کیا خطا کی تھی۔ خدا کی پرستش میں وہ گوروں سے کہیں زیادہ انہماک دکھاتے تھے۔ گرجا جاتے۔ پادریوں کے وعظ سنتے یسوع مسیح پر ایمان لاتے۔ صدیوں کے غم سے بھری ہوئی دردناک آوازوں میں مذہبی گیت گاتے۔ پھر بھی خدا کے دربار میں ان کی شنوائی نہ ہوتی۔ پھر بھی گورے رنگ کے عیسائی ان کو نفرت اور حقارت کی نظر سے دیکھتے۔ اس کو وہ واقعہ اب تک یاد تھا جب اس نے

غلطی سے ایک گوری عورت کے سفید ریشمی لباس کو چھو لیا تھا۔ وہ سڑک کے نکڑ پر اخبار بیچ رہا تھا۔ گوری عورت نے اس سے اخبار لیا۔ اور اپنے بیگ میں ریزگاری تلاش کرنے لگی۔ ریچہ کی نگاہیں بے اختیار اس عورت کے سفید لباس پر جم گئیں۔ کتنا سفید تھا وہ فراک، دودھ سے بھی زیادہ سفید۔ ان بطخوں سے بھی زیادہ سفید جن کو اس نے ایک دفعہ جھیل میں تیرتے ہوئے دیکھا تھا۔ کتنا سفید تھا وہ فراک، سفید اور چکنا۔ نظر بھی پھسلی جاتی تھی "نرم بھی ضرور ہوگا" اس نے فراک کی چمکیلی سطح کو غور سے دیکھتے ہوئے سوچا۔ اور پھر نہ جانے کیوں اس کا جی چاہا کہ اس کپڑے کو چھو کر دیکھے۔ نرم نرم چکنی چکنی چیزوں کو چھو کر ان پر ہاتھ پھیر کر کتنا مزا آتا تھا! ایک دفعہ اس کو کالے ریشم کا ایک ٹکڑا پڑا مل گیا تھا۔ چکنا اور چمکدار۔ وہ اس نے اپنے چھوٹے سے مقفل صندوقچے میں چھپا کر رکھ چھوڑا تھا اور جب موقعہ ملتا اس ٹکڑے کو نکال کر اس پر دھیرے دھیرے ہاتھ پھیر کر دیکھتا کہ اس کی ملائمت باقی ہے یا نہیں۔ مگر اس گوری عورت کا یہ فراک تو اس سے بھی کہیں زیادہ چکنا اور چمکدار تھا۔ اور پھر سفید تھا۔ دودھ سے بھی زیادہ سفید جھیل کی بطخوں سے بھی زیادہ سفید۔ اور سفید چیزوں میں نہ جانے کیا خوبی تھی۔ کیا جانے کیا خوبی تھی، کیا جادو تھا کہ دیکھتے ہی وہ بیقرار ہو جاتا۔ اس کو چھونے میں تو اور بھی مزا آئے گا۔ اس نے اپنا کالا ہاتھ اٹھایا اور گوری عورت کے دامن کو چھو لیا۔

گوری عورت بیگ سے پیسے نکال کر دینے ہی والی تھی کہ اس نے ایک کالے ہاتھ کو اپنے کپڑوں سے مَس ہوتے دیکھا اور اپنی چھتری بند کر کے بچے کو مارنا شروع کر دیا۔

"بدتمیز۔ ذلیل کتے۔ تیری یہ مجال! چل تجھے پولیس کے حوالے کرتی ہوں" اور پولیس کے ڈر سے وہ سر پر پاؤں رکھ کر ایسا بھاگا کہ اخباروں کا بنڈل بھی وہیں رہ گیا۔ اس کی سزا میں اخبار والے نے اگلے دن سے اس کو اخبار دینے بند کر دیئے۔

شہروں میں چاروں طرف اونچی اونچی عمارتیں تھیں۔ آسمان تک اونچی۔ سڑک پر کھڑے ہو کر وہ اوپر نظر کرتا تو معلوم ہوتا کہ ہر عمارت کی چوٹی بادلوں میں تیر رہی ہے۔ بادل چلتے ہوئے نہ معلوم ہوتے بلکہ ایسا نظر آتا جیسے عمارت آہستہ آہستہ ڈھلک رہی ہے۔ اور وہ ڈر کے مارے پھر سیدھا کھڑا ہو جاتا کہ کہیں اینٹ اور پتھر کا یہ پہاڑ اس کے سر پر نہ آ ٹوٹے۔

جب اخبار بیچنے کا سلسلہ بند ہو گیا تو اس نے سڑکوں پر آوارہ پھرنا شروع کر دیا۔ کتنا خوبصورت شہر تھا۔ صاف صاف سڑکیں۔ کالی کالی چکنی چکنی چمکدار موٹریں۔ دھڑادھڑ دھڑادھڑ چلنے والی بجلی کی ریلیں جگمگاتے ہوئے سینما اور تھیٹر۔ بڑے بڑے ہوٹل۔ لذیذ کھانوں سے بھرے ہوئے ریستوران۔ وہ گھنٹوں شیشے کی دیواروں میں سے اندر سجے ہوئے کیک، پیسٹری، بھل بھنی ہوئی مرغیوں اور شراب

کی بوتلوں کو دیکھتا رہتا۔ وہ سب نعمتیں اس کے سامنے موجود تھیں۔ اتنی قریب کہ وہ چاہے تو ان کو چھو سکتا تھا۔ ایک دن بے اختیار اس نے ہاتھ بڑھا دیا۔ کھٹ سے شیشے کی موٹی چادر سے ٹکرایا۔ ایک پولیس والے نے کرخت آواز میں گھر کا: "او کالے بدمعاش چپلتا پھرتا نظر آ نہیں تو ڈنڈا رسید کرتا ہوں" اور لال سبز کیک پر حسرت بھری نظر ڈال کر بچہ آگے بڑھ گیا۔

نہ جانے کیوں دنیا کی سب اچھی اچھی چیزیں گورے آدمیوں ہی کے لئے ہیں؟ بچہ کے ننھے دماغ میں یہ سوال ایک شہد کی مکھی کی طرح بھنبھناتا رہتا۔ آخر کیوں؟ ہوٹل۔ یعنی عالیشان مکان۔ سب جگہ گورے آدمی ہی رہتے تھے۔ کالے اگر اس دنیا میں تھے تو نوکروں کی حیثیت سے۔ ہوٹلوں میں ویٹر۔ سینما گھروں کے سامنے پہرے دار عالیشان مکانوں میں ملازم۔ جب گورا مالک اور مالکن اپنی موٹر میں بیٹھنے کے لئے گھر سے نکلتے تو کالا نوکر ادب سے ان کے لئے موٹر کا دروازہ کھولے کھڑا رہتا۔ آخر کیوں؟ آخر کیوں؟

دنیا کی سب چیزیں گوروں کے لئے تھیں۔ مگر آسمان پر جہاں خدا رہتا ہے وہاں ضرور کالوں اور گوروں کے ساتھ یکساں سلوک ہوتا ہوگا۔ بچے کو اس کا یقین تھا۔ اور رات کو جب وہ پھرتے پھرتے تھک جاتا تو سڑک کے کنارے بیٹھ کر وہ سر اوپر اٹھا کر آسمان

طرف دیکھتا۔ ستارے اس کی طرف دیکھ کر مسکراتے اور وہ بھی اپنی بھوک، اپنی تھکن کو بھول جاتا۔ اس نے سنا تھا کہ مرکر انسان آسمان پر خدا کے پاس چلے جاتے ہیں۔ وہ سوچتا اچھا ہی ہو اگر میں مر جاؤں۔ پھر میں بھی وہاں جہاں ستارے ہیں مزے سے رہوں گا۔ میرا باپ انتظار کرتا ہوگا۔ میں وہاں جاؤں گا تو وہ کتنا خوش ہوگا مگر زندگی کا ان تھک جھکڑ ان خیالات کی فرصت ہی کب دیتا تھا پھر کوئی پولیس کا سپاہی پتھر کی سڑک پر اپنے قدموں سے کھٹ کھٹ کرتا آتا اور ڈانٹ کر کہتا۔ "چلو چلو۔ اٹھو یہاں سے کیا چوری کا ارادہ ہے۔ اپنے گھر جاؤ۔ ایک دم سے"

اس کا گھر شہر کے اس حصہ میں تھا جہاں سب کالے ہی کالے رہتے تھے۔ ایک پرانا اصطبل۔ کسی زمانے میں یہاں گھوڑے بندھا کرتے تھے۔ مگر اب موٹروں کی وجہ سے گھوڑا گاڑیوں کا رواج جاتا رہا تھا۔ اصطبل مدت سے بے کار پڑا تھا۔ اور بہت سے غریب کالے لوگ جن کا کہیں ٹھکانا نہیں تھا یہاں آکر سو جاتے تھے۔

رات کو جب وہ "گھر" واپس آتا۔ تو اسے ایسا معلوم ہوتا کہ وہ جنت سے جہنم میں آگیا ہے۔ کہاں گورے آدمیوں کے وہ عالیشان مکان۔ کہاں یہ گندی، بدبو دار، اندھیری چالیں۔ یہاں کی سڑکیں بھی خراب تھیں۔ اور روشنی کا انتظام نہ ہونے کی وجہ سے کالوں کے لئے رات بھی کالی رہتی۔ ہاں مگر اس اندھیری اور تکلیف دہ دنیا میں

بس ایک جگہ تھی جہاں کانوں کو بھی راحت نہیں تو کم سے کم خودفراموشی نصیب تھی۔ وہ شراب خانہ ! وہ کئی بار وہاں گیا تھا۔ وہاں اس کو چاروں طرف اپنے جیسی کالی شکلیں ہی نظر آتی تھیں۔ کالے مرد کالی عورتیں جن کے دانت گوری عورتوں سے کہیں خوبصورت تھے ویٹر۔ ڈرائیور۔ خانگی ملازم۔ چپراسی۔ بوٹ پالش کرنے والے خادمائیں۔ مامائیں۔ انائیں۔ باورچی اور باورچنیں۔ مگر یہاں تو وہ صرف مرد اور عورتیں۔ مرد اور عورتیں۔ عورتیں اور مرد۔ کھانا اور شراب۔ سگرٹ کا دھواں۔ اور اس دھوئیں کو چیرتی ہوئی قہقہوں کی لہریں۔ اور پھر کوئی پیانو پر بیٹھ جاتا۔ اور اس پرانے بغیر پالش کے پیانو میں سے موسیقی کا ایک طوفان جس میں سب ڈوب جاتے مرد اور عورت ناچنا شروع کر دیتے۔ تھرک تھرک کر۔ مٹک مٹک کر ہنس کر۔ مسکرا کر۔ قہقہے لگا کر۔ اچھل کر۔ کود کر۔ تالیاں بجا کر۔ موسیقی اور سگرٹ کا دھواں اور شراب کی بو اور کالے کالے چہروں پر پسینہ کی چمک۔ اور پھر کوئی گانا شروع کر دیتا۔ اور اس موسیقی اور اس گانے میں نو برس کے کالے بچے کو نو ہزار برس کی داستان سنائی دیتی۔ اس کی قوم کی داستان۔ ایک دردبھری کہانی۔ اس کو ایسا محسوس ہوتا۔ کہ موسیقی کی لہروں میں بہتا ہوا وہ دور کسی ساحل پر پہنچ گیا ہے۔ اندھیری رات ہے اور سناٹا۔ جنگل سائیں سائیں کر رہا ہے۔ چاروں طرف خوفناک جانوروں کی آتشیں آنکھیں

نظر آ رہی ہیں۔ پھر کہیں دور سے ڈھولک کی آواز آتی جو آہستہ آہستہ اور قریب ہوتی جاتی۔ ایک ہولناک آہنگ۔ جس کو سن کر دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی اور ایک نامعلوم قوت اس کے رویئیں رویئیں میں سما جاتا۔ آسمان کا خوف، سمندر کا خوف، اور طوفان کا خوف، بھوت پریت اور جادو کا خوف۔ شیر، چیتے اور گھڑیال کا خوف۔ ان خوفوں سے بڑھ کر انسان کا خوف۔ اور بچے کو اس موسیقی میں ایک نئی خوفناک دھن سنائی دیتی۔ زنجیروں کی جھنکار۔ غلامی کے احساس سے دم گھٹنے لگتا۔ مگر پھر کہیں زمین کی لامحدود وسعتوں میں سانس آتا۔ اور کپاس کے کھیتوں میں ہزاروں گلوں سے ایک دردناک نغمہ اٹھتا اور آسمان کی اونچائی میں کھو جاتا۔

بچہ اس کہانی کو کچھ سمجھتا اور کچھ نہ سمجھتا۔ مگر جب تک پیانو بجنا بند ہوتا۔ وہ نسلی جذبات اور محسوسات کے اس سمندر میں غوطے کھاتا رہتا۔ اور جب پیانو بجنا بند ہو جاتا تو اس کو ایسا معلوم ہوتا۔ جیسے ایک زوردار لہر نے اس کو ساحل پر پٹک دیا ہو۔

شراب خانے میں سب اس سے اچھا سلوک کرتے تھے۔ کوئی کھانے کو کچھ دیتا۔ کوئی پینے کو، روٹی کا ایک توس۔ گوشت کا ایک ٹکڑا، کافی کی پیالی۔ اس کا پیٹ بھر ہی جاتا۔ مگر ایک رات اس کو کسی نے شراب کا آدھا گلاس پلا دیا۔ اس کو ایسا معلوم ہوا جیسے چاقو سے اس کے گلے کو چیرا جا رہا ہے۔ چند لمحوں کے بعد گلے کی

چرمراہٹ جاتی رہی۔ مگر اس کا سر بھولنے لگا۔ فٹ بال کی طرح۔ کم سے کم اسے محسوس ایسا ہی ہوا۔ فٹ بال بڑھتے بڑھتے کپا بن گیا اور وہ ڈرا کہ کہیں سر اتنا بڑا نہ ہو جائے کہ میں دروازے میں پھنس جاؤں۔ اس لئے وہ باہر نکل گیا۔ مگر دریا کی ٹھنڈی ہوا کا ایک تھپڑ ہی پڑا تھا کہ سر پھر اپنی اصلی حالت پر آ گیا۔ مگر اس کے بدن میں جو بھوک اور بخار سے بالکل کمزور ہو گیا تھا۔ ایک دم نہ جانے کہاں سے اتنی طاقت آ گئی۔ بدن میں طاقت اور دل میں ہمت۔ اس نے سوچا۔ میں ابھی سوؤں گا نہیں۔ شہر کی سیر کر دوں گا۔ اور اس کے قدم سڑک پر نہیں ہوا پر چل رہے تھے!

چلتے چلتے وہ پھر گوروں کی دنیا میں پہنچ گیا۔ روشنیاں جگمگا رہی تھیں۔ ہوٹل اور شراب خانے، ناچ گھر، سب گورے مردوں اور گوری عورتوں سے بھرے ہوئے تھے۔ مگر ایک نکڑ پر یہ اتنے بہت سے کالے آدمی کہاں سے آ گئے تھے؟ ان کا یہاں کیا کام؟ ان میں سے ایک کہہ رہا تھا "ہمارے ایک ساتھی کو مارا ہے۔ تو ہم دس کا خون کریں گے" بچے کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ کہ یہ کیا بات ہے اس لئے وہ دیوار کے سایہ سے لگا لگا آگے بڑھتا گیا۔

جھن سے شیشے ٹوٹنے کی آواز آئی۔ اور ساتھ ہی ایک شور۔ پولیس کی سیٹی۔ کچھ لوگ بھاگ رہے تھے۔ کچھ لوگ ان کا تعاقب کر رہے تھے۔ دور سے اور شیشوں کے ٹوٹنے کی آواز آئی پولیس کی سیٹیاں، عورتوں کی چیخیں۔ اور ان سب ملی جلی آوازوں کو چیرتی

ہوئی گولی چلنے کی تڑاخ دار آواز۔ پھر چھن سے شیشے ٹوٹنے کی آواز۔
بچے کی کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ کہ کیا ہو رہا ہے۔ لوگ کیوں بھاگ
رہے ہیں۔ عورتیں کیوں چیخ رہی ہیں۔ گولیاں کیوں چل رہی ہیں۔ اس کے
دماغ میں تو بس ایک ہی خیال تھا۔ ریستوران کی وہ شیشے کی دیوار،
جس کے پیچھے دنیا کی سب نعمتیں رکھی ہوئی ہیں۔ اگر اور شیشے کی دیواریں
ٹوٹ رہی ہیں۔ تو وہ بھی توڑی جا سکتی ہے۔ یہ خیال آتے ہی وہ بھاگا
ٹھوکر کھائی، گرا۔ اٹھا۔ پھر بھاگا۔ بے تحاشا بھاگا۔ پولیس کی سیٹی
سنائی دی۔ مگر وہ نہ رکا۔

وہ رہی شیشے کی دیوار۔ اندر رنگ برنگ کے کیک اسی طرح
جگمگا رہے تھے۔ لال لال سیب۔ زرد زرد سنگترے۔ سبز رنگ کے
کیلے اور ان میں اور اس میں صرف ایک شیشے کی دیوار حائل تھی۔ مگر اور
شیشے کی دیواریں توڑی جا رہی ہیں۔ تو یہ بھی توڑی جا سکتی ہے۔ اس نے
ایک پتھر اٹھایا۔ اور پورے زور سے دے مارا۔

چھن سے شیشہ ٹوٹنے کی آواز آئی۔ اس کے اور دنیا کی نعمتوں
کے درمیان جو دیوار حائل تھی۔ وہ ٹوٹ گئی۔

وہ کیک اور پھل اٹھانے کے لئے لپکا۔

ایک تڑاخہ ہوا۔ بچے کو اپنے بائیں پہلو میں ایک ٹیس محسوس
ہوئی۔ ایک دفعہ اس کو ایک شہد کی مکھی نے کاٹ لیا تھا۔ اس لمحے
اس کو ایسا محسوس ہوا۔ جیسے ایک شہد کی مکھی اس کے گوشت

کو گولی کی رفتار سے چیر کر اندر گھس گئی ہے۔ اس کے بعد اس کے دماغ پر ایک سیاہی چھا گئی۔ جو اس کے رنگ سے بھی زیادہ تاریک تھی۔

جب اسے ہوش آیا تو وہ ہسپتال میں تھا۔ بائیں پہلو میں شہد کی مکھی اب بھی کاٹ رہی تھی —— ایک گورا ڈاکٹر کہہ رہا تھا "بچہ بہت کمزور ہے۔ اور زخم گہرا ہے۔ شائد سیپٹک بھی ہو گیا ہے۔ مجھے ڈر ہے۔ کہ کہیں صبح تک مر نہ جائے۔"

"نہیں ڈاکٹر صاحب! ایسا کیوں کہتے ہیں" نرس — ایک گوری نرس نے کہا "کوشش کرنی چاہئیے۔ شائد بچ جائے۔ کتنا بھولا ہے بچارا"

اور بچے کو ڈاکٹر کا کہنا اچھا معلوم ہوا۔ اور نرس کا کہنا برا۔ "اب بھی میرے بچنے کی امید ہے!" اس نے سوچا "نہیں، نہیں۔ میں زندہ نہیں رہنا چاہتا۔ اس زندگی میں مجھے کوئی سکھ نہیں ہے۔ یہاں زہریلی شہد کی مکھیاں کاٹتی ہیں۔ میں تو مرنا چاہتا ہوں تاکہ آسمان پر اللہ میاں کے پاس آرام سے رہوں۔ میرا باپ مجھے دیکھ کر کتنا خوش ہوگا" اور ہلکی سی آہ کے ساتھ اس کے منہ سے یہ آواز نکلی "وہ دیکھو ستارے اچھے اچھے ستارے۔ مجھے بلا رہے ہیں"

موت نے زندگی کی طرف دیکھ کر فاتحانہ انداز سے مسکراتے ہوئے کہا۔ بس چند گھنٹوں کی اور دیر ہے۔ یہاں ہی نہیں دنیا کے کونے کونے میں میرا ہی راج ہے۔

ایک بوڑھا

ایک بوڑھا

زندگی اور موت !
مقابلہ سخت تھا !

زندگی اور موت !

مقابلہ سخت تھا !

موت لشکر ساتھ لے کر آئی تھی ۔ بڑھاپا، کمزوری ۔ بھوک ۔ جب پیٹ میں خوراک کا ایک دانہ نہ جائے گا تو زندگی کا چکر کیسے چل سکتا ہے ۔

ستر برس کا بوڑھا ایک پلنگ پر پڑا تھا ۔ اس کا بدن سوکھا ہوا تھا ۔ نہ گوشت نہ خون ۔ بس ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ ۔ پیٹ کمر کو لگ گیا تھا ۔ سات دن سے اس نے کچھ نہ کھایا تھا ۔ بڑھتے ہوئے لشکر کی طرح کمزوری اس پر آہستہ آہستہ غلبہ پا رہی تھی ۔ آواز بھی مشکل سے نکلتی تھی ۔

مگر بوڑھے کی دھنسی ہوئی آنکھوں میں زندگی کی ایک عجیب چمک تھی ۔ اس کے ہونٹوں پر بچوں کی سی مسکراہٹ ۔ اس کے دل کی حرکت بے قاعدہ ہو گئی تھی مگر اس کا دماغ ـــــ اس کا دماغ ایک لاجواب مشین کی طرح اب تک بالکل ٹھیک کام کر رہا تھا ۔ اس کا سکریٹری پائنتی بیٹھا ہوا اخبار پڑھ کر سنا رہا تھا ۔ تمام ملک میں بوڑھے کے فاقے نے ہلچل مچا دی تھی ۔ ہزاروں نے حکومت سے اپیل کی تھی

کہ اس کو چھوڑ دیا جائے۔ ہزاروں نے اس سے اپیل کی تھی کہ وہ اکیس
دن کے فاقے سے اپنی جان جوکھوں میں نہ ڈالے۔ اخبار کے ایڈیٹر نے
اپنے افتتاحیہ مضمون میں لکھا تھا "ہم امید کرتے ہیں کہ وہ اپنے ملک
اور قوم کی خاطر اس فاقے کو توڑ ڈالیں گے اور اپنی قیمتی زندگی کو
موت سے بچا لیں گے۔ ہم کسی حالت میں اپنے محبوب قائد کی ہلاکت
گوارا نہیں کر سکتے۔" بوڑھے نے یہ سنا اور مسکرا دیا۔

ایک نوجوان خطوں اور تاروں کا ایک انبار لے کر داخل ہوا۔ سب کا
مضمون ایک ہی تھا ——— خدا کے لئے فاقے توڑ ڈالئے۔ آپ کی
جان قوم کی امانت ہے۔ اس کو ضائع نہ کیجئے۔ بوڑھے نے سنا اور
مسکرا دیا۔

کئی ڈاکٹر داخل ہوئے۔ اور بوڑھے کا معائنہ کیا۔ نبض۔
دل کی حرکت۔ آنکھیں۔ اور بوڑھا دھیمی آواز میں ان سے مذاق
کی باتیں کرتا رہا۔ ایک ڈاکٹر کے چہرے پہ پریشانی کے آثار
دیکھ کر بوڑھا بولا "ارے بھئی فاقہ میں کر رہا ہوں یا تم؟" اور
اس کی آنکھیں ہنسنے لگیں۔

ڈاکٹر دوسرے کمرے میں مشورہ کے لئے چلے گئے۔
ایک نے کہا "یہ کمال ہے۔ سات دن ہو گئے۔ ایک دانہ
پیٹ میں نہیں گیا۔ اس حالت میں زندہ رہنا ہی ایک معجزہ ہے۔"
دوسرے نے کہا "مگر دل کی حرکت کمزور ہوتی جا رہی ہے۔"

تیسرے نے کہا " اس سے تو میں بھی پریشان ہوں۔ بدن میں طاقت ہی نہیں ہے۔ کیسے موت کا مقابلہ کر سکتا ہے ؟ "

موت قریب ہی کھڑی یہ سب باتیں سن رہی تھی۔ وہ یہ سن کر ناتخانہ انداز سے مسکرائی۔ اور پھر بوڑھے کے کمرے میں جاکر اس کے سرہانے کھڑی ہوگئی۔

موت کو کوئی نہ دیکھ سکتا تھا۔ مگر بوڑھے کی بوڑھی بیوی نے محبت کی آنکھوں سے جب اپنے شوہر کی طرف دیکھا تو اس کو سرہانے موت کھڑی ہوئی نظر آئی۔ اس کو ایسا معلوم ہوا جیسے موت مسکرا رہی ہے اس نے آنکھیں بند کرلیں۔ اور خدا سے دعا کی " اے خدا۔ میرے خاوند کی جان بچادے۔ میری لاج تیرے ہاتھ ہے۔ اے خدا ایسا نہ ہو کہ میری موت سے پہلے میرا خاوند مجھ سے بچھڑ جائے "

پھر وہ بوڑھے کے پلنگ کے قریب جاکر بیٹھ گئی۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ اپنے شوہر کے آگے ہاتھ جوڑے اور کہے " میری خاطر یہ فاقہ توڑ ڈالو۔ اپنی جان سے نہ کھیلو " مگر اس کی زبان سے ایک لفظ نہ نکلا۔

ساٹھ برس کی ازدواجی زندگی میں اس نے اپنے شوہر کے ارادوں کی مخالفت نہ کی تھی۔ اپنے مذہب کے قانون توڑے۔ اور اصولی زندگی کو خیرباد کہا۔ دھن دولت کو تیاگ دیا۔ حکومت سے دشمنی مول لی۔ درجنوں بار ہوا مگر پھر بھی بیوی نے اف نہ کی۔ اس کا

پریم اس منزل پر پہنچ چکا تھا۔ جہاں "میں اور تو" کا سوال ہی نہیں رہتا اس نے اپنی خودی کو شوہر کی خودی میں تحلیل کر دیا۔ اب اس کا شوہر سے کہنا کہ وہ برت توڑ دے ایسا ہی تھا۔ جیسے وہ اپنے آپ سے کہے۔ وہ خاموش رہی۔ مگر اپنی آنکھوں پر اس کو قابو نہ تھا۔ آنسوؤں سے اُمڈ آئیں۔

بوڑھے نے بیوی کی آنکھوں میں آنسو دیکھے اور مسکرا کر بولا "بیگی پریشان مت ہو۔ میں مروں گا نہیں"۔ بیوی نے آنسو پونچھ ڈالے اور مسکراہٹ کی ہلکی سی جھلک سے جھریوں دار چہرہ چمک اٹھا۔

یہ اس نے بیوی کی پریشانی دور کرنے کے لئے ہی نہیں کہا تھا۔ وہ واقعی زندہ رہنا چاہتا تھا۔ زندہ رہنے پر تلا ہوا تھا۔ وہ زندگی کا قائل تھا۔ زندگی سے منہ موڑنا اس کے ایمان کے خلاف تھا۔ جب ہی تو وہ موت سے اتنے اطمینان کے ساتھ کھیل سکتا تھا۔

بوڑھا تمام دنیا میں اپنی خصوصیات کے لئے مشہور تھا۔ کوئی اس کو پاگل کہتا تھا کوئی چالاک وسیاستدان۔ روحانی شعبدے باز۔ ننگا فقیر۔ اس کو کیا کیا خطاب نہ ملے تھے۔ حکومت نے اس کو باغی قرار دے کر پھر قید کر دیا تھا۔ اس کے دشمن اسے غدار۔ مکار۔ دھوکے باز اور نہ جانے کیا کیا کہتے تھے۔ مگر اسکی قوم کے کروڑوں انسان اس کے نام پر جان قربان کرتے تھے اس کی پوجا کرتے تھے۔

مگر اس کی قوم کے لوگ خود اس کے دوست اور رفقائے کار بھی اس بوڑھے کی بعض حرکتوں کو سمجھنے سے قاصر تھے۔ وہ کہتا تھا کسی جانور کو دکھ دینا پاپ ہے۔ اس نے اپنی قوم کو ہتھیاروں کے بغیر جنگ کرنا سکھایا تھا۔ دشمن کو سچائی اور عدم تشدد سے زیر کرنے کا گُر بتایا تھا۔ کسی حد تک اس میں کامیابی بھی ہوئی تھی۔ مگر ایسے وقت میں جب چاروں طرف سے دنیا میں جنگ کے دیوتا کا دور دورہ ہو۔ جب خون کے دریا بہ رہے ہوں۔ جب ہلاکت اور ظلم اور تشدد انسانی زندگی کے اصول بن چکے ہوں۔ اس کا عدم تشدد کی تعلیم دینا حماقت نہیں تو مضحکہ خیز ضرور معلوم ہوتا تھا۔ وہ دشمن کو مارنا نہیں اپنانا چاہتا تھا۔ وہ بمبار ہوائی جہازوں ٹینکوں مشین گنوں۔ زہریلی گیسوں کا مقابلہ روحانیت اور سچائی کے مظاہرے سے کرنا چاہتا تھا۔ وہ مشینوں کی طرح سوئے ہوئے بے روح بے دماغ سنگدل ظالموں کے احساس انسانیت کو بیدار کرنا چاہتا تھا۔ کوئی کہتا تھا وہ مہاتما ہے۔ کوئی کہتا وہ پاگل ہے۔

اس کی روحانیت سے انکار مگر اس کی قیادت سے انکار نہ تھا۔ وہ اپنی قوم کے جذبۂ آزادی کا مظہر تھا۔ اور ان کی جنگ آزادی میں ان کا جرنیل۔ اس نے کروڑوں انسانوں کو آزادی کے لئے کٹ مرنا۔ مرجانا۔ سکھایا تھا۔ حکومت نے بوڑھے کو اور اس کے

ساتھیوں کو قید کر دیا۔ ملک میں ایک آگ لگ گئی۔ حکومت کے ظلم کا جواب لوگوں نے تشدد سے دیا۔ جان کا بدلہ جان سے اور آنکھ کا بدلہ آنکھ سے لیا۔ بوڑھا برسوں سے انقلابی تشدد کے طوفان کو روکے ہوئے تھا۔ جب وہ قید ہو گیا تو یہ طوفان قانون کی بندشوں کو توڑ کر تمام ملک میں پھیل گیا۔

اخباروں میں لمبے چوڑے بیان شائع ہوئے۔ مضمون لکھے گئے۔ کتابیں چھاپی گئیں۔ اور ان سب میں اعلان کیا گیا کہ تشدد کا تمام تر ذمہ دار یہ ننگا فقیر ہے۔ اہنسا کے پجاری کو ایک خونی بھیڑئیے کے روپ میں پیش کیا گیا۔ اس کے عمر بھر کے کام کو ملیا میٹ کرنے کی کوشش کی گئی۔ دنیا یہ سن کر دنگ رہ گئی کہ عدم تشدد کے بھیس میں یہ بوڑھا تشدد پھیلاتا رہا تھا۔ اور بوڑھا خود قید میں تھا۔ ان الزامات کو پڑھ کر اس کی روح تلملا گئی۔ اس نے اپنی خودی میں سے غصہ اور نفرت نکال پھینکے تھے، وہ اپنے دشمنوں سے بھی پریم کرتا تھا۔ اس کا دل رنج اور افسوس سے بھر گیا۔ اسے معلوم نہ تھا کہ اس کے ساتھ اتنی سخت بے انصافی کی جائے گی۔ مگر وہ قید میں تھا۔ نہ کوئی خط لکھ سکتا تھا نہ بیان شائع کرا سکتا تھا۔ دنیا میں اپنے اصولوں کی لاج رکھے تو کیونکر؟ اپنے بدن کو بھوک کی سزا دے کر موت سے مقابلہ کر کے۔ اس کے پاس تو بس ایک ہی نسخہ تھا

جو پہلے بھی وہ پانچ بار استعمال کر چکا تھا۔

اس نے ملک کے حکمران کو لکھ بھیجا۔ "آپ نے اور آپ کے افسروں نے مجھ پر عجیب عجیب الزام لگائے ہیں۔ حالانکہ آپ کو معلوم ہے کہ چالیس برس سے میں سچائی اور عدم تشدد کے اصولوں کی تبلیغ کر رہا ہوں۔ اور مجھے جواب دینے کا کوئی موقعہ نہیں دیا گیا۔ ایسی حالت میں میرے لئے صرف ایک ہی راستہ ہے وہ ہے فاقہ کر کے اپنے نفس کو مارنا۔ لہذا میں نے طے کر لیا ہے کہ میں اکیس دن فاقہ کروں گا۔ میرا مقصد اپنے آپ کو ہلاک کرنا نہیں ہے۔ نہ سیاسی اغراض کے لئے آپ کو اس طریقہ سے مجبور کرنا۔ بلکہ بے انصافی کے خلاف اس عدالت میں کرنا ہے جو آپ کی اور دنیا کی ہر عدالت سے اونچی ہے۔ اگر میں اس دوران میں مر گیا تو میں اپنی بے گناہی پر پورا ایمان رکھتے ہوئے اس دنیا سے رخصت ہوں گا۔ آئندہ نسلیں فیصلہ کر سکیں گی کہ کون حق پر تھا؟ آپ یا میں۔ دنیا کی ایک عظیم الشان سلطنت کا نمائندہ یا میرے جیسا ایک فقیر شخص جو اپنے ملک اور تمام انسانیت کا ادنیٰ خادم ہے۔"

اور اب اس تاریخی برت کے سات دن گذر چکے تھے۔ بوڑھا لمحہ بہ لمحہ کمزور ہوتا جا رہا تھا۔ چالیس کروڑ انسان اس کی زندگی کے لئے دعا مانگ رہے تھے۔ ہزاروں اس سے درخواست

کر رہے تھے کہ برت توڑ ڈالے۔ ڈاکٹر پریشان تھے۔ موت انتظار کر رہی تھی کہ کب اس لافانی روح کو سمیٹ کر عالم بالا کی طرف لے جائے۔

مگر بوڑھا مسکرا رہا تھا

ایک شہر

زندگی اور موت!

مقابلہ سخت تھا!

موت لشکر کے لشکر ساتھ لے کر آئی تھی۔ بمبار ہوائی جہاز۔ ٹینک۔ سینکڑوں میل کی مار کرنے والی توپیں۔ مشین گنیں۔ رائفلیں اور بندوقیں اور ریوالور۔ زہریلی گیس۔ سپاہیوں کے دل بادل۔ بے روح اور بے دماغ سپاہی جن کو زندگی کی بجائے "موت کی تعلیم" دی گئی تھی۔ جن کے دلوں کو انسانیت۔ رحم۔ ہمدردی کے جذبات سے اس طرح خالی کر دیا تھا جیسے لیموں کو آہنی انگلیوں سے نچوڑ کر سارا رس نکال دیا گیا ہو۔

ایک شہر۔ نوجوان شہر۔ موت کا مقابلہ کر رہا تھا۔

ایک شہر۔ فولاد کا شہر۔ جس کا نام اس دیس کے سب سے

بڑے سورما کے نام پر رکھا گیا تھا۔ بے جگری سے دشمن کا مقابلہ کر رہا تھا۔ پورا شہر لڑائی کے میدان میں اترا ہوا تھا۔ مرد۔ عورتیں۔ بچے۔ فوجی سپاہی ہواباز۔ انجنیئر اور ڈاکٹر۔ مصنف اور شاعر۔ اخبار نویس اور آرٹسٹ۔ موٹر ڈرائیور اور باورچی۔ معمار اور مزدور۔

شہر کی عمارتوں میں کوئی دیوار سالم نہ تھی۔ ہر جگہ بم کے گولوں کے گھاؤ نمایاں تھے۔ مگر گوشت اور پوست کی انسانی دیوار فولاد کی طرح اٹل کھڑی تھی۔ اس دیوار کو دشمن کے پے در پے حملے نہ ہٹا سکے تھے نہ ہلا سکے تھے۔

شہر دریا کے کنارے بسا ہوا تھا۔ دریا کا پانی انسانی خون سے مل کر لال ہو گیا تھا۔

شہر میلوں تک پھیلا ہوا تھا۔ فیکٹریاں۔ کارخانے۔ سکول۔ کالج ہسپتال۔ رہنے کے مکان۔ دکانیں۔ سڑکیں۔ باغات۔ پارک اور آج ہر طرف تباہی ہی تباہی تھی۔ جہاں کبھی زندگی کا دور دورہ تھا وہاں آج موت کا راج تھا۔ جہاں ہنستے ہوئے بچے نظر آتے تھے وہاں آج لاشیں پڑی سڑ رہی تھیں۔ سکولوں۔ کالجوں۔ لائبریریوں میں آتشیں بموں نے آگ لگا دی تھی۔ شہر کے کونے کونے سے دھوئیں کے کالے بادل اٹھ کر آسمان کی طرف جا رہے تھے۔

اس شہر کے رہنے والے مہینوں سے اپنی زندگی اپنے شہر کی زندگی کے لئے لڑ رہے تھے۔ ان کے رہنے کے مکان بھاری

سے کھنڈر ہو گئے تھے۔ وہ دن رات خندقوں میں رہتے تھے۔ ہر لمحہ شہر پر گولیوں کی بارش ہوتی رہتی تھی۔ وہ نہ سوتے تھے نہ کام کرتے تھے، نہ ہنستے تھے، نہ مسکراتے تھے۔ کپڑے پھٹ گئے تھے۔ داڑھیاں بڑھی ہوئی تھیں۔ آنکھیں سرخ ہو گئی تھیں۔ پیٹ سوکھے ہوئے تھے۔ کئی کئی دن فاقے سے گذر جاتے تھے۔ بھوک اور پیاس کا احساس ہی جاتا رہا تھا۔ دن اور رات میں کوئی فرق نہ رہا تھا۔ دن میں دھوئیں کے بادلوں میں سورج چھپا رہتا اور رات کو شعلوں کی روشنی ہوتی۔ دن۔ تاریخ۔ وقت۔ سب بے معنی ہو گئے تھے۔

اس شہر کی تاریخ عجیب تھی۔ ایک زمانہ میں یہ ایک معمولی قصبہ تھا۔ اس کا نام ایک جابر اور ظالم بادشاہ کے نام پر رکھا گیا تھا۔ ان دنوں دنیا کے اور شہروں کی طرح یہاں بھی بیکار امیر پڑے پڑے عیش کرتے تھے۔ اور غریب مزدور باوجود سخت محنت کرنے کے بھوکے مرتے تھے۔ پھر انقلاب کا طوفان اٹھا۔ مزدوروں اور کسانوں نے تخت و تاج کو مٹی میں ملا دیا۔ عوام کی حکومت قائم کی۔ مگر ظالم اور جابر رجعت پسند اور سرمایہ داریوں آسانی سے ماننے والے تھوڑے ہی تھے۔ گھمسان کی لڑائی ہوئی۔ خانہ جنگی کے شعلے ملک بھر میں بھڑک اٹھے۔ اس شہر میں اس دریا کے کنارے اس انقلابی جنگ کا ایک فیصلہ کن معرکہ ہوا

شہنشاہ پرستوں نے شہر پر قبضہ کر لیا تھا۔ مگر مردمیدان کے زیر کمان
انقلابی فوجوں نے حملہ کیا۔ شہر کے لوگ استبداد اور ظلم کے خلاف
کھڑے ہو گئے۔ اور رجعت پسندوں کو شکست فاش ہوئی۔ شہر کا
نام بدل کر اسی مرد میدان کے نام پر رکھا گیا جس نے اس کو انقلاب اور
آزادی کی خاطر دشمن کے پنجے سے بچایا تھا۔

پچیس برس میں اس شہر کی صورت ہی بدل گئی۔ جو مزدور اندھیرے
گندے، شکستہ مکانوں میں رہتے تھے۔ ان کے لئے شاندار خوبصورت
عمارتیں بنائی گئیں۔ ان کے بچوں کے لئے سکولوں اور کالجوں
کے دروازے کھول دیئے گئے۔ نوابوں۔ زمینداروں۔ سرمایہ داروں
کے محلوں میں مزدوروں کے لئے کلب اور ہسپتال قائم کئے گئے
نئے کارخانے قائم ہوئے۔ ریلیں۔ ٹرامیں بجلی۔ تار۔ ٹیلیفون
پارک۔ تھیٹر۔ سینما۔ لائبریریاں اور ہر چیز کام کرنے والوں کے لئے
زندگی کی ایک نئی لہر شہر میں دوڑ گئی۔ نہ صرف اس شہر میں بلکہ اس
دیش کے ہر شہر میں۔ ہر گاؤں میں۔ آخرکار ہزاروں برس کے بعد
انسان نے اپنی دنیا کی دولت پر قبضہ کر لیا۔ غاصبوں اور ظالموں
کو مار بھگایا۔ مزدور راج قائم ہوا۔ زندگی کی فتح ہوئی۔

مگر موت اور ہلاکت کے دیوتا کب خاموش بیٹھتے ہیں۔ دنیا میں
امن اور چین، مساوات اور عوام کی بہبودی دیکھ کر وہ جل جاتے ہیں۔

کوشش کرتے ہیں کہ پھر زندگی پر موت غلبہ پائے۔ انصاف پر بے انصافی۔ مساوات پر استبداد۔ اجالے پر اندھیرا۔ موت کے لشکروں نے زندگی کے اس عظیم الشان منظر پر حملہ کر دیا۔ امن عالم کو پھر جنگ کی بھٹی میں جھونک دیا۔

قتل و غارت کا طوفان خوفناک رفتار سے بڑھا شیطانی دماغوں نے سائنس کی مدد سے وہ وہ ہتھیار تیار کئے تھے۔ کہ ان کے سامنے کوئی طاقت نہیں ٹھیر سکتی تھی۔ شہر ویران ہو گئے۔ کھیتیاں جلا دی گئیں۔ لاکھوں کا خون ہوا۔ عورتیں بیوہ ہو گئیں اور بچے یتیم۔ زندگی کے قدم اکھڑ گئے۔

مگر اس شہر پر زندگی نے پھر قدم جمائے۔ موت کے لشکروں کو رکنا پڑا۔ دشمن نے شہر کا محاصرہ کر لیا۔ زندگی موت کے طوفان میں رک گئی۔

اور یونہی کئی ماہ سے مقابلہ ہو رہا تھا۔ دشمن اپنی بے پناہ قوت کو لئے شہر کے سامنے پڑا تھا۔ شہر پر بمباری ہو رہی تھی۔ چاروں طرف آگ اور تباہی ہی کے آثار نظر آ رہے تھے۔ شہر جل رہا تھا۔ اور موت فاتحانہ انداز سے مسکرا رہی تھی۔

زندگی خاموش تھی۔ مگر زندگی کے قدم مستحکم تھے۔

ایک بچّہ

زندگی نے اپنے ہتھیار اٹھائے۔

صبح ڈاکٹر آیا۔ اس نے دیکھا۔ کہ بچہ تکلیف سے کراہ رہا ہے۔ باوجود رنگ کالا ہونے کے اس کے چہرے پر خون کی کمی سے زردی جھلک رہی تھی سانس بھی مشکل سے آرہا تھا۔

"نرس"!

"جی ڈاکٹر صاحب!"

"آکسیجن!"

موت، گیس کا زندگی بخش سلنڈر آتے دیکھ کر گھبرا سی گئی۔ نلکی لگا ہوا قیف، بچے کی ناک پر رکھ دیا گیا۔ سانس آسانی سے آنے لگا۔ مگر چہرے پر زردی کی جھلک بدستور تھی۔

"نرس!"

"جی ڈاکٹر صاحب!"

"نقلی خون کرنا پڑے گا"!

"میں حاضر ہوں"!

"تمھارے خون کا امتحان ہوچکا ہے؟"

"جی ہاں! اس بچے کے خون کا امتحان کرا کے مقابلہ بھی کرا لیا ہے"!

"تمھیں اپنا خون ایک کالے بچے کو دینے میں کوئی اعتراض نہیں ہے؟"
"جی نہیں، میں نسل و رنگ کے امتیاز کو نہیں مانتی۔"
"شاباش"

نرس کے گورے گداز بازو میں ایک موٹی سوئی گھسا دی گئی۔ ایک ربڑ کی نلکی میں سے ہوکر لال لال خون ایک بوتل میں جمع ہوتا گیا۔ بچہ حیرت سے یہ سب دیکھتا رہا۔ جیسے کوئی نئی قسم کا کھیل ہو۔ پھر اس کے بازو پر سے آستین الٹ دی گئی۔

"ڈرنا مت، شاباش! بس ذرا سی تکلیف ہوگی۔"

بازو میں ایک ہلکی سی ٹیس ہوئی اور بوتل میں خون کم ہونے لگا۔ موت پریشان ہوگئی۔ اس کے لشکر کے قدم اکھڑنے ہی والے تھے۔ کہ اس نے نیا داؤ کھیلا۔ بچے کے کان میں کہا "زندہ رہنے سے کیا فائدہ! دُنیا میں کالے رنگ کے لئے دُکھ ہی دُکھ ہے۔ گندے، سڑے مکان۔ گوروں کی گالیاں اور ٹھوکریں۔ اور پھر کوئی زہریلی شہد کی مکھی کاٹ لے گی۔ زندہ رہنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ آسمان پر ستارے تمھیں بلا رہے ہیں۔ اور خود اللہ میاں انتظار میں کھڑے ہیں۔"

نقلی خون کا عمل ختم ہوگیا۔ تو ڈاکٹر نے پوچھا "کیوں بیٹا! اب کچھ بہتر معلوم ہوتا ہے؟"

"میں زندہ نہیں رہنا چاہتا ڈاکٹر صاحب! مجھے ستارے بلا رہے

ہیں بستارے اور اللہ میاں ۔"

"نہیں بیٹا! ایسی باتیں نہیں کرتے۔ تم جلد اچھے ہو جاؤ گے ۔"

مگر بچے کو اپنے تلخ تجربات یاد آرہے تھے۔ اُس کی سمجھ میں نہ آتا تھا۔ کہ بھیک مانگنے اور گالیاں کھانے کے لئے اس کو زندہ رکھنے پر کیوں مجبور کیا جا رہا ہے ۔ اُس نے ڈاکٹر کی طرف سے منہ موڑ لیا۔

ڈاکٹر نے نرس سے کہا "جب تک وہ تعاون نہ کرے ۔ ہم مریض کو کیسے اچھا کر سکتے ہیں۔ صحت کے لئے دوا سے زیادہ قوتِ ارادی کی ضرورت ہے ۔"

یہ سُن کر موت، پھر فاتحانہ انداز سے مسکرا دی "ہر جگہ میری فتح ہے!"

ایک بوڑھا

ایک بوڑھا مر رہا تھا۔ ایک قوم زندہ ہو رہی تھی ۔

انسان کے جسم کی مشین بھی عجیب ہے ۔ جب تک بدن کے سب اعضاء مل کر اپنا کام نہ کریں۔ کل پرزوں میں خرابیاں پیدا ہو ہی جاتی ہیں۔ معدے میں اگر خوراک نہ جائے تو علاوہ

کمزوری کے بدن میں زہریلے اثرات پیدا ہو جاتے ہیں۔
بارہویں دن ڈاکٹروں نے بوڑھے کے قارورہ کا کیمیائی معائنہ کیا۔ تو اس میں ایک تشویش ناک زہریلا مادہ پایا۔ اگر دو تین دن اور اسی طرح گذرے تو پھر جان کی خیر نہیں۔
ایک ڈاکٹر جو بوڑھے کا دوست بھی تھا اس کے پاس گیا۔ اور کہا " دیکھئے، اس وقت میں ایک ڈاکٹر ہوں۔ نہ آپ کا دوست نہ چیلا۔ میرا فرض انسان کی جان بچانا ہے۔ آپ کے جسم میں خوراک نہ جانے سے زہریلے اثرات پیدا ہو رہے ہیں۔ آپ کی جان خطرے میں ہے۔ اس لئے مجھے آپ کو فاقہ توڑنے پر مجبور کرنا ہوگا۔"
بوڑھا کچھ سوچ کر ہلکے سے مسکرایا۔ طاقت اتنی کم ہو گئی تھی کہ وہ اب زور سے بول بھی نہیں سکتا تھا۔ ڈاکٹر نے اپنے کان سوکھے ہوئے ہونٹوں کے پاس لگا دیئے " ڈاکٹر یہ میری عزت کا معاملہ ہے۔"
" نہیں، یہ آپ کی جان کا معاملہ ہے۔"
" اچھا ایک تک مہلت دے سکتے ہو؟"
" چوبیس گھنٹے۔ اگر کل صبح بھی قارورہ میں یہ زہریلا مادہ نکلا۔ تو آپ کو برت توڑنا ہی پڑے گا۔"
" اچھا بھئی! تمہاری۔" اور یہ کہہ کر بوڑھے نے آنکھیں بند

کریں۔ اور دل ہی دل میں پرارتھنا کی۔ "اے خدا! میری لاج تمہارے ہی ہاتھ ہے"!

بوڑھے کا برت اس وقت نہ صرف ایک ملک، بلکہ تمام دُنیا کی توجہ کا مرکز بنا ہوا تھا، دور دراز کے غیر ملکی اخباروں کے نمایندے، ہوائی جہازوں سے اس برت کی رپورٹ بھیجنے کے لئے آرہے ہوئے تھے۔ ہر چند گھنٹوں کے بعد ڈاکٹر، بوڑھے کی صحت کے متعلق بیان دے رہے تھے۔ چالیس کروڑ آنکھیں ادھر ہی لگی ہوئی تھیں تار، ٹیلیفون، اخبار، ہر ممکن ذریعہ سے منٹ منٹ کی خبر تمام ملک میں پھیل جاتی تھی۔

ایک بوڑھا مر رہا تھا۔ ایک قوم زندہ ہو رہی تھی۔

ملک کے کونے کونے میں قوم پرستوں کے انقلابی مظاہرے جلسے جلوس، ریزولیوشن، حکومت کے نام تار، بوڑھے کی رہائی کے مطالبے، اخباروں میں مضامین، سیاسی پارٹیوں، کے لیڈروں کے بیانات، ہر دل میں دھڑکن، جوش اور بوڑھے کی محبت۔

ایک صبح خبر آئی۔ کہ خود دشمن کے کیمپ میں پھوٹ پڑ گئی۔ بوڑھے کے تین ہم قوموں نے جو اب تک غیر ملکی حکمران کے مشیر خاص بنے ہوئے تھے۔ استعفیٰ دیدیا۔ بوڑھے کو پلنگ پر لیٹے لیٹے یہ سب خبریں مل رہی تھیں۔ اس کا مشن کامیاب ہو رہا تھا۔ اس نے

اپنے ملک کو، اپنے اصولوں کو، پھر دُنیا کے سامنے سرخرو کر دکھایا تھا اُس نے جان کی بازی لگا کر پھر پانسہ جیت لیا تھا۔ مگر اُس کے تن اور من میں ایک زبردست جنگ ہو رہی تھی۔ اُس نے ڈاکٹر سے وعدہ کر لیا تھا۔ کہ اگر صبح تک زہریلے اثرات دُور نہ ہوئے، تو وہ برت توڑ دے گا۔ برت ٹوٹ جائے گا۔ اس کا سب کیا کرایا خاک میں مل جائے گا۔ اس کی عزت خاک میں مل جائے گی۔ دُنیا اُس پر ہنسے گی۔ خیر، اس کا اُسے کوئی خاص افسوس نہ تھا۔ مگر دُنیا اُس کے اصولوں پر ہنسے گی۔ نہیں، وہ ایسا کبھی نہیں ہونے دیگا۔ اُس نے آنکھیں بند کر لیں۔ اس کی قوت ارادی، بدن کی گھٹتی ہوئی طاقت کے باوجود، آستین چڑھا کر زہر کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہو گئی۔ مگر کیا بدن کا کیمیائی عمل، ایک ستر برس کے بوڑھے کی روحانی قوت سے رُک جائے گا !؟

موت، زندگی کی امید پرستی پر ہنس رہی تھی۔

ایک شہر

موت کے لشکر برابر بڑھتے آ رہے تھے۔ گر زندگی نے ہار نہ مانی تھی۔ شہر کے مضافات پر دشمن کا قبضہ ہو گیا تھا۔ خود شہر کے آدھے

حصے میں گھمسان کی لڑائی ہو رہی تھی۔ ہر سڑک، ہر گلی، ہر مکان پر بہادر ڈٹ کر مقابلہ کر رہے تھے۔ ایک ایک انچ پر خون بہا رہے تھے۔ جان دے رہے تھے۔ عورتیں اور بچے بندوقیں لئے لڑ رہے تھے۔ دشمن کے ہزاروں سپاہی کام آئے۔ مگر ان کے ٹینکوں، ہوائی جہازوں، اور توپوں کا آہنی سیلاب بڑھتا ہی چلا آ رہا تھا۔

موت خوش تھی، ہنس رہی تھی۔ "چند روز کی بات ہے، فتح یقینی ہے۔"

مگر زندگی نے ابھی ہمت نہ ہاری تھی۔ شہر کے باشندے قسم کھائے ہوئے تھے۔ کہ دشمن کو ہماری لاشوں پر سے ٹینک گذارنے ہوں گے۔ گوشت اور خون کی ایک چٹان تھی۔ جو دشمن کے راستے میں کھڑی ہوئی تھی۔

آخر کون سا جذبہ تھا وہ، جو ان شہریوں کی ہمتوں کو ابھارے ہوئے تھا۔ آزادی کا جذبہ، مساوات اور انسانیت کا جذبہ۔

ایک سپاہی سے کسی غیر ملکی اخبار نویس نے پوچھا "وہ کونسی وہ طاقت ہے۔ جو تمہارے شہر کو اب تک دشمن کے بے پناہ لشکروں کے خلاف لڑنے پر آمادہ کر رہی ہے؟"

سپاہی نے کہا "بھائی! میری عمر چالیس برس ہے۔ معلوم ہے۔ میں کہاں پیدا ہوا؟ اسی شہر میں۔ سؤروں کے ایک اصطبل میں۔ وہیں سوکھی گھاس کے ایک ڈھیر میں ایک

سوورنی نے بچے دئے تھے۔ اور وہیں میری ماں نے مجھے جنا تھا۔ میرا باپ ایک زمیندار کا غلام تھا۔ میری ماں، مجھے جنم دینے کے تین دن بعد کام پر جانے کے لئے مجبور کر دی گئی تھی۔ بس وہیں سوٗرنی کے بچوں کے پاس پڑا رہتا تھا۔ سردی لگتی۔ تو ان سوٗر کے بچوں کے ساتھ ان کی ماں کے گرم جسم کے ساتھ لپٹ جاتا۔ یہ تھی ہماری زندگی اُس زمانے میں۔ اور پھر انقلاب آیا۔ اور کایا پلٹ گئی۔ ہم انسان بن گئے۔ ہمارے لئے اچھے اچھے مکان بنے۔ ہسپتال اور کالج میرا لڑکا اور لڑکی یونیورسٹی میں پڑھتے ہیں۔ سمجھے! یہ ہیں انقلاب کے نتائج!۔ اس انقلاب کو بچانے کے لئے آج ہم اپنی جانیں دے رہے ہیں۔ کیونکہ ہم جانتے ہیں۔ کہ اگر دشمن کامیاب ہو گیا۔ تو مزدوروں اور کسانوں کی حالت پھر جانوروں، کتوں اور سوٗروں سے بدتر ہو جائے گی، یہ موت اور زندگی کا سوال ہے میرے بھائی!"

شہر کے مردوں، عورتوں اور بچوں کی دیوار اٹل کھڑی تھی۔

اور پھر ایک دن خبر آئی۔ کہ شمال کی طرف سے کمک آ رہی ہے شہر میں ہر شخص کے چہرے پر زندگی اور بشاشت کے آثار نظر آنے لگے۔ ہمتیں بلند ہو گئیں۔ سینے تن گئے۔

موت کے لشکر کے قدم اکھڑ گئے۔ موت گھبرا سی گئی۔

ایک بچہ

نرس پریشان تھی۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا۔ کہ کس طرح کالے بچے کے جذبۂ زندگی کو بیدار کرے۔

دن بھر وہ کروٹ لئے، دیوار کی طرف مُنہ کئے ہوئے پڑا رہتا تھا آکسیجن اور نقلی خون نے اس کی جان بچالی تھی۔ انجکشنوں نے زخم کے زہر کا اثر کم کر دیا تھا۔ مگر اس کی قوتِ ارادی نے زندگی سے عدم تعاون کر رکھا تھا۔ اور وہ دھیرے دھیرے موت کی تاریک گہرائیوں کی طرف پھسلتا جا رہا تھا۔

کالے بچے کے ننھے دماغ میں یہ خیال سمایا ہوا تھا۔ "یہ گوروں کی دُنیا ہے۔ ایک کالے آدمی کے لئے یہی بہتر ہے کہ وہ مر جائے۔ تمام گوری نسل کے خلاف اس کا دل نفرت اور غصے سے بھرا ہوا تھا۔ ڈاکٹر اور نرس دونوں اس نسل سے تھے۔ اس لئے وہ ان کی شکل بھی دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔ زبردستی دوا پلاتے تو پی لیتا۔ انجکشن کی تکلیف سہہ لیتا۔ لیکن پاس بیٹھ کر نرس، اس سے بات کرنے اس کا دل بہلانے کی کوشش کرتی۔ تو وہ کوئی جواب نہ دیتا۔ اور دیوار کی طرف مُنہ کر لیتا۔

مگر نرس نے ہمت نہ ہاری تھی وہ زندگی کی فوج کی بہادر

سپاہی تھی۔ اس کا فرض موت کا مقابلہ کرنا تھا۔ اس کے علاوہ خود اس کے کوئی اولاد نہ تھی۔ اس کے دل میں ہر بچے کے لئے خواہ وہ کالا ہو یا گورا۔ ایک مادرانہ جذبہ تھا۔ ہر بچہ اُس کا بچہ تھا اس کالے بچے کو بھی وہ اپنا بچہ تصوّر کرتی تھی۔ اس نے طے کر لیا تھا کہ وہ اسے مرنے نہ دیگی۔

ایک دن نرس کو بیٹھے بیٹھے ایک نئی ترکیب سوجھی۔ اس نے اپنا چھوٹا سا ریڈیو اٹھا کر کالے بچے کے کمرے میں اس کے پلنگ کے پاس لگا دیا۔ بٹن دباتے ہی کمرہ موسیقی کی لہروں سے لبریز ہو گیا بچے کے دل و دماغ میں موسیقی کے لئے ایک عجیب کشش تھی۔ شائد یہ ورثہ تھا۔ جو اُس کو اپنی نسل سے ملا تھا۔ جیسے ہی اس نے گانے کی آواز سُنی اس نے دیوار کی طرف سے مُنہ ہٹا کر دوسری طرف کر لیا۔ نرس ایک لکڑی کے صندوقچے کے پاس کھڑی مسکرا رہی تھی۔ آواز صندوقچے میں سے آ رہی تھی، کتنی سُریلی، کتنی میٹھی۔

کتنے ہی دنوں کے بعد پہلی بار بچے کی آنکھوں میں زندگی کی چمک نظر آئی۔ وہ مسکرا دیا۔ نرس کو ایسا معلوم ہوا۔ جیسے اُسے کسی نے دنیا کی سب سے بڑی نعمت بخشدی ہو۔

موسیقی کی نرم نرم بارش کمرے میں ہوتی رہی۔ بچے کو ایسا محسوس ہوا جیسے اُس کی روح کے زخموں پر کسی نے محبت بھرے ہاتھوں سے مرہم لگا دیا ہو۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ تا کہ ترنم

کا یہ فردوسی چشمہ صرف کانوں کے ذریعے اس کے بدن کے ہر حصے میں
رِس جائے۔

مگر تھوڑی دیر میں موسیقی کا پروگرام ختم ہوگیا۔ اناؤنسر کی آواز
آئی: "اب لاسلکی کی لہروں پر ہم آپ کو دور دراز ملک میں لیجاتے
ہیں جہاں سے ہمارا نمایندہ آپ کو دُنیا کی عجیب و غریب جنگ کا
حال سُنائے گا۔" اور پھر ایک دوسری اور کسی قدر دھیمی آواز —
جیسے دور سے آ رہی ہو، سُنائی دی۔

"میں جان اسمتھ بول رہا ہوں۔ میں ایک جنگی رپورٹر ہوں
میں نے پچھلے بیس سال میں آدھی درجن جنگوں کی خبریں اخباروں
اور ریڈیو کے ذریعے ملک والوں تک پہنچائی ہیں۔ پچھلی جنگ عظیم، کوریا
کی لڑائی، جنگ حبش، جنگ ہسپانیہ، چین اور جاپان کی جنگ اور
اب یہ دوسری جنگ عظیم۔ مگر آج میں آپ کو دُنیا کی سب سے حیرتناک
جنگ کا حال سُناتا ہوں۔ یہ ہوائی جہازوں، توپوں اور ٹینکوں
کی جنگ نہیں ہے۔ یہ زندگی اور عورت کی جنگ ہے۔ اور میدان جنگ
ایک بوڑھے آدمی کا کمزور جسم ہے۔ جو سترہ دن سے فاقہ کر رہا
ہے ...."

نرس نے پوچھا۔ "یہ پروگرام بدل کر کوئی دوسرا موسیقی کا پروگرام
لگا دوں؟"

کالے بچے نے کہا: "نہیں، نہیں۔ میں اس بوڑھے کا حال سُنتا

چاہتا ہوں —" نہ جانے کیوں ؟ اُس کو ایسا معلوم ہو رہا تھا۔ جیسے اس بوڑھے کی زندگی اور اس کی اپنی زندگی میں قریب کا تعلق ہے۔

ایک بوڑھا

موت، ایک دفعہ پیچھے ہٹ کر پھر زور شور سے دھاوا کر رہی تھی۔
ڈاکٹر بوڑھے کی قوتِ ارادی کے معجزے پر متحیر اور خوش تھے مگر اگلے چار دن کے خیال سے ہراساں تھے۔
قارورے میں جو زہریلا مادہ پیدا ہونے لگا تھا۔ وہ آپ سے آپ۔ بغیر کسی دوا کے، بغیر کسی غذا کے دور ہو گیا تھا۔ سائنس حیران تھی، زندگی نازاں، اور بوڑھا مسکرا رہا تھا۔ اس کو ڈاکٹر فاقہ توڑنے پر مجبور نہ کر سکے۔ وہ اب تک زندہ تھا۔ اس کا دماغ اب بھی کام کر رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں اب بھی چمک تھی۔ اس کی مشہور حاضر جوابی کا اب بھی وہی حال تھا۔
مگر سترہ دن کے فاقے کا اثر ہونا ہی تھا۔ دل کمزور ہوتا جا رہا تھا۔ حرکت برائے نام ہی تھی۔ ڈاکٹر آلے لگا کر دیکھتے تو ایسا محسوس ہوتا۔ جیسے کسی گھڑی میں چابی ختم ہو رہی ہو اور اس کی رفتار اتنی دھیمی ہو جائے۔ کہ ہر لمحے رک جانے کا

اندیشہ ہو۔

موت کو اپنی فتح کا پھر یقین ہو چلا تھا۔ مگر زندگی نے ہمت نہ ہاری تھی۔

ایک بوڑھا مر رہا تھا۔ ایک قوم زندہ ہو رہی تھی۔

ملک کے کونے کونے میں، محلوں میں، جھونپڑوں میں، کلب میں اور چوپال میں، ریل گاڑیوں میں، بیل گاڑیوں میں، ہر جگہ بس ایک چرچا، ایک خیال، ایک آرزو، صرف ایک امید، بوڑھے کی جان بچ جائے۔ وہ اپنے کڑے امتحان میں کامیاب ثابت ہو۔

مندروں میں، اور مسجدوں میں، شوالوں میں اور خانقاہوں میں، گرجاؤں اور اگیاریوں میں، اس کی زندگی کے لئے دعائیں کی جا رہی تھیں۔ نماز کے بعد بوڑھی مسلمان عورتیں گڑگڑا کر خدا سے دعائیں مانگ رہی تھیں۔ "اے رحیم و کریم! ہماری قوم کے بوڑھے باپ کی جان بخش دے۔" پوجا اور گیتا پاٹھ کے بعد بوڑھی ہندو عورتیں بھگوان سے پرارتھنا کرتی تھیں۔ "اے بھگوان! تو بڑا دیالو ہے۔ ہم پر، ہمارے دیش پر کرپا کر۔" بچے دو دو وقت کے فاقے کر رہے تھے۔ تاکہ کھانے کی قیمت بچا کر خیرات کر دیں۔ شادیاں اور خوشیاں، جشن اور جلسے۔ تہوار اور پیج اس وقت تک کے لئے ملتوی کر دئیے گئے تھے۔ جب تک بوڑھے کا فاقہ خیریت سے ختم نہ ہو۔

بوڑھا مر رہا تھا۔ اور اس کا اصول، اس کا دھرم زندہ ہو رہا تھا تمام دنیا اس کے خیالات میں دلچسپی لے رہی تھی۔ اس کی کتابیں، اس کے مضامین کو غور سے پڑھا جا رہا تھا۔ اس کی روحانی سیاست کا مقابلہ دُنیا کے حکمرانوں کی چالبازی اور خود غرضی سے کیا جا رہا ہے۔ لوگ حیران تھے۔ کہ کون سی طاقت ہے۔ جو اس ضعیفی اور کمزوری کی حالت میں اس ستّر برس کے بوڑھے کو زندہ رکھے ہوئے ہے۔ بوڑھے اور اس کے اصولوں کے ساتھ ساتھ اس کی قوم کی جنگ آزادی کا بھی پرچار ہو رہا تھا۔ ایک غزوے کے فاقے نے دُنیا کے چالاک سیاستدانوں کو پریشان کر دیا تھا۔

ایک بچّہ

نرس از حد خوش تھی۔

جب سے کالے بچے کے کمرے میں ریڈیو لگا تھا۔ اس کی حالت میں حیرتناک تبدیلی ہو گئی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے اسے زندگی میں نئے سرے سے دلچسپی ہو گئی ہو۔ اب وہ کبھی دیوار کی طرف منہ کر کے نہ لیٹتا۔ اس کا مزاج بھی چڑچڑا نہ رہا تھا۔ وہ خوشی خوشی دوا پیتا۔ انجکشن لگوا لیتا۔ ڈاکٹر اور نرس دونوں سے ہنس کر

ات کرنا۔

ریڈیو کے جادو بھرے ڈبے میں سے موسیقی کا چشمہ بہتا۔ اور وہ گھنٹوں لیٹا لیٹا، آنکھیں بند کئے ہوئے اس کی نرم نرم لہروں میں بہتا رہتا۔ مگر بارہ بجے جب اناؤنسر کہتا۔ ....

"اب

"لاسلکی کی لہروں پر ہم آپ کو ایک دور دراز ملک میں لیجاتے ہیں......" وہ آنکھیں کھول کر تکیوں کے سہارے لگ کر بیٹھ جاتا نہ جانے۔ اس کو دور دراز ملک کے بوڑھے سے اتنا لگاؤ کیوں ہوگیا تھا۔ شائد اس لئے کہ اس نے جنگی رپورٹر کی زبانی سنا تھا کہ بوڑھے کو بچوں سے بہت محبت ہے۔ شائد اس لئے کہ عمر بھر بوڑھا گوروں کی ایک زبردست حکومت سے بے ہتیاروں کی جنگ کرتا رہا تھا۔ خود اس کا یہ قصہ بھی اسی جنگ کا ایک معرکہ تھا۔ کالے بچے نے سنا تھا کہ بوڑھے نے اپنے ملک کے کروڑوں کالے رنگ کے لوگوں کو خودداری سکھائی تھی۔ خودداری، خوداعتمادی، آزادی اور اصولوں کے لئے لڑجانا۔ مرجانا۔ ان باتوں کو سن کر کالے بچے کے ذہن پر سے ناامیدی اور مایوسی کے بادل چھٹ جاتے اور وہ سوچتا میں بھی جب بڑا ہو جاؤں گا تو اس بوڑھے کی طرح اپنے لوگوں کو آزادی کے لئے لڑنا اور مرنا سکھاؤں گا۔

پھر جب اس نے ریڈیو پر سنا کہ بوڑھے کی حالت نازک

ہو تی جا رہی ہے اور وہ اکیس دن کے فاقے سے جانبر نہ ہو سکے گا تو کالے بچے کو ایسا معلوم ہوا جیسے خود اس کے جسم سے تندرستی اور زندگی نکلی جا رہی ہے۔ اس کا دل بجھ سا گیا۔ وہ بہت دیر تک اپنے پلنگ پر چپکا آنکھیں بند کئے پڑا رہا۔ اس عرصے میں ریڈیو نہ جانے کیا کیا کہتا رہا۔ اس نے کچھ نہ سنا۔ مگر پھر بندوقیں چلنے کی اور بم پھٹنے کی خوفناک آواز آئی تو وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔

اناؤنسر کہہ رہا تھا۔

"ڈررئیے مت۔ یہ ہم آپ کے گھر سے چھ ہزار میل کے فاصلہ پر پھٹ رہے ہیں۔ لاسلکی کے ذریعہ صرف ان کی آواز ہم آپ تک پہنچا رہے ہیں تاکہ آپ نہ صرف اس جنگ کا حال ہی سن سکیں بلکہ خود اپنے کانوں سے اس جنگ کی اصلی آوازوں کو بھی سن سکیں۔ یہ جنگ آپ کے گھروں سے بہت دور ہو رہی ہے۔ مگر یہ آپ ہی کی جنگ ہے۔ آپ کے اصولوں کی خاطر، آپ کی آزادی کی خاطر، آپ کی ماں بہنوں کی عزت کی خاطر لڑی جا رہی ہے۔ لال لشکر کے یہ بہادر سپاہی جو گلتے ہوئے میدان جنگ کی طرف جا رہے ہیں، یہ آپ کے ساتھی ہیں۔ یہ آپ کے دشمن کو اپنے گوشت پوست کی دیوار سے روکے ہوئے ہیں۔ یہ اپنی جان کی قربانی دے کر آپ کی اور آپ کے وطن کی حفاظت کر رہے ہیں۔ ان کی آواز آپ کی آواز ہے......"

اور پھر کالے بچے کا کمرہ ایک پُر جوش گانے سے گونج اٹھا۔

لال لشکر کے سپاہیوں کا گیت ایک نامعلوم زبان میں تھا۔ وہ اس کا مطلب نہ سمجھ سکتا تھا۔ مگر ان آوازوں میں وہی خود فراموشی، وہی جوش، وہی خلوص تھا جو اس کو اپنے کالے لوگوں کے گانوں میں ملتا تھا۔ اس کا جی چاہا وہ بھی ان سپاہیوں کے ساتھ ہوتا اور اسی طرح گاتا ہوا میدانِ جنگ کی طرف جاتا۔

گانا آہستہ آہستہ دور ہوتا گیا۔ پھر اناؤنسر کی آواز آئی۔

"آئیے آپ کو ہم اس شہر کی سیر کرائیں جو اپنی شجاعت کی وجہ سے دنیا کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گا۔ وہ شہر جو سال بھر سے دشمن کی بے پناہ فوجوں کے خلاف ڈٹا ہوا ہے۔ وہ شہر جس میں کوئی عمارت سالم نہیں، جہاں رات دن موت کی بارش ہوتی ہے جہاں چاروں طرف آگ لگی ہوئی ہے۔ مگر جہاں کے مرد، عورتیں اور بچے اپنے شہر اور اپنے ملک کی آزادی کی خاطر ایک ایک انچ پر کٹ رہے ہیں، مر رہے ہیں، مر رہے ہیں، مگر پیچھے نہیں ہٹ رہے"

ریڈیو میں سے گڑگڑاہٹ کی آواز آئی۔ ٹینکوں کی گڑگڑاہٹ ہوائی جہازوں کی خوفناک گونج۔ گولوں کے دھماکے۔ گویونگی سنتا رہا، اور کالا بچہ اپنے زخم کی تکلیف بھول گیا۔ اس کو ایسا معلوم ہوا کہ وہ ایک ہسپتال میں نہیں ہے بلکہ اس شہر میں ہے جہاں لال لشکر دشمن کے خلاف ڈٹا ہوا ہے۔ اور اس کو یقین ہو گیا کہ نہ لال لشکر پیچھے ہٹے گا نہ وہ خود موت کے سامنے ہار مانے گا۔

ایک شہر

شہر سے میل بھر باہر دشمن کی فوجیں خندقوں میں پڑی تھیں۔ وہ وہاں سال بھر سے پڑی ہوئی تھیں۔ برسات کی بارش، کیچڑ، جاڑے کی برفباری، خون کو جما دینے والی سردی — کیا کچھ ان کو برداشت نہ کرنا پڑا تھا۔ مگر جس چیز نے ان کے قدم اکھاڑ دئے تھے۔ ان کے حوصلے پست کر دیئے تھے، وہ شہر والوں کی ہمت تھی جو باوجود ہتیاروں کی کمی کے لڑے ہی جاتے تھے۔ دشمن کی فوج کے ہر سپاہی کو ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس کا مقابلہ معمولی انسانوں سے نہیں بلکہ ایسی مافوق البشر ہستیوں سے ہے جن پر کوئی ہتیار کارگر ثابت نہ ہوتا تھا۔

ایک دفعہ نہیں، دو دفعہ نہیں، درجنوں بار، سینکڑوں بار دشمن کی فوج نے شہر پر دھاوا کیا تھا۔ ہوائی جہازوں سے بمباری کرکے شہر کی اینٹ سے اینٹ بجا دی تھی۔ ٹینکوں کے آہنی ہاتھیوں کو ساتھ لے کر حملہ کیا تھا۔ مضافات تاخت و تاراج کرتے ہوئے شہر کے بیچوں بیچ پہنچ گئے تھے۔ مگر پھر شہر والوں نے ان کو مار بھگایا تھا اور انھیں دوبارہ اپنی خندقوں میں بڑی بڑی دیواروں کے سائے میں، پناہ لینی پڑی تھی۔ یہ شہری فوجی

اور ان سے بالکل ناواقف تھے۔ ان کو معلوم ہی نہ تھا کہ قاعدے سے وہ ہار چکے تھے۔ لڑے ہی جاتے تھے۔ مرے ہی جاتے تھے اور لڑتے بھی تو کتنے اوٹ پٹانگ طریقے سے۔ نہ کوئی باقاعدہ باوردی فوجی دستے۔ نہ ٹینک۔ نہ ہوائی جہاز۔ بس ہر ایک شہری ایک بندوق ہاتھ میں لئے اس طرح لڑ رہا تھا جیسے یہ اس کی اپنی ذاتی لڑائی ہو۔ جب دشمن کے ٹینک اور فوجی دستے سڑکوں پر سے گزرتے ہوئے شہر کے بیچ بیچ جاتے تو ہر لوٹے پھوٹے مکان، ہر کھنڈر ہر دروازے، ہر کھڑکی، ہر سوراخ میں سے ان پر گولیوں کی بارش ہوتی۔ اور شہر والوں کے جھنڈ کے جھنڈ انقلابی نعرے لگاتے ہوئے، اپنی جان کی پرواہ نہ کرتے ہوئے، ٹینکوں پر ٹوٹ پڑتے خوفناک اور گھمسان کی دست بدست لڑائی ہوتی اور دشمن کے دستوں کو پیچھے ہٹنا ہی پڑتا۔

اور اب خبر آئی تھی کہ لال لشکر کے کئی بڑے دستے شہر کی مدد کو آرہے ہیں۔ دشمن کی فوج کا جرنیل گھبرایا ہوا تھا۔ نہ آگے بڑھ سکتا تھا نہ پیچھے ہٹ سکتا تھا۔ اس کی فوجیں سال بھر سے پڑی ہوئی تھیں مگر یہ کم بخت شہر تھا کہ زیر ہی نہیں ہوتا تھا۔ ایسا شہر اس نے نہ کبھی دیکھا تھا نہ سنا تھا۔ پچھلے تین سال میں مختلف ملکوں میں درجنوں شہروں پر اس نے اور اس کی فوجوں نے حملہ کیا تھا اور ہر شہر پر تھوڑی بہت لڑائی کے بعد قبضہ

کر لیا تھا۔ مگر یہ عجیب شہر تھا جس کے رہنے والے ہار کے لفظ سے نا واقف تھے، زیر ہونا جانتے ہی نہیں تھے۔ اور اب اگر عقب سے لال لشکر کے دستوں نے حملہ کر دیا تو اس کی فوج کا تو چکی کے دو پاٹوں میں پس کر خاتمہ ہی ہو جائے گا۔

اس نے ٹیلیفون کے ذریعے اپنے ملک کے جابر حکمران کو خبر بھیجی کہ حالت نازک ہوتی جا رہی ہے۔ اس کو اجازت دی جائے کہ وہ اپنی فوج کو پیچھے ہٹا لے۔ اس شہر کو فتح کرنے کا خیال چھوڑ دے۔

جابر حکمران ہزار میل پرے آرام سے اپنے گرم کمرے میں گدّے دار کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کو تو بس ایک ہی دھن تھی "نہیں۔ یہ شہر، فتح ہونا چاہیئے۔ چاہے کچھ ہی ہو جائے۔ پرواہ نہیں۔ تم لڑتے جاؤ "

جرنیل نے ٹیلیفون رکھ دیا۔

ایک سپاہی گھبرایا ہوا داخل ہوا۔ اس کا سانس چڑھا ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ جیسے اس نے دن دھاڑے کوئی بھوت پریت دیکھ پایا ہو۔ بڑی مشکل سے وہ کہہ پایا۔

"لال لشکر نے شمال کی جانب سے حملہ کر دیا ہے "

ایک اور سپاہی دوڑا ہوا آیا۔

"شہر والے ہماری خندقوں پر ٹوٹ پڑے ہیں "

ایک بوڑھا

بوڑھے کا آخری وقت تھا۔ موت سرہانے کھڑی مسکرا رہی تھی۔
فاقے کے بیس دن گذر چکے تھے۔ آج آخری دن تھا۔ مگر
ڈر تھا کہ شاید یہ بوڑھے کی زندگی کا آخری دن ثابت ہو۔ دل
کی حرکت برائے نام رہ گئی تھی۔ کمزوری بے حد بڑھ گئی تھی۔
بوڑھے کے دشمن، اس کو قید کرنے والے، اس کی موت
کا انتظار کر رہے تھے۔ ان کو یقین تھا کہ چند گھنٹوں، چند منٹوں
کی دیر ہے۔
بوڑھے کو قید کرنے والے، اس کے کریاکرم کا انتظام کر رہے
تھے۔ چتا کے لئے صندل کی لکڑیاں منگا لی گئی تھیں۔ کفن کا انتظام
ہو گیا تھا۔ "نہایت افسوس کے ساتھ اعلان کیا جاتا ہے کہ آج
______ بجے" صرف وقت کے لئے جگہ چھوٹی ہوئی تھی۔
ایک قوم کے دل میں امید کا دیا بجھنے کے قریب تھا۔
بوڑھے کی آنکھیں کمزوری کے باعث بند تھیں مگر جب کھلتی تھیں
تو ان میں وہی چمک، وہی زندگی۔ موت کے سائے کا نام نہیں۔
حالانکہ اس کے بدن کی قوت جواب دے چکی تھی۔ معلوم ہوتا
[illegible]

ڑھے کی زندگی کا انحصار بدن کی قوت پر ہے ہی نہیں۔

بوڑھے نے آنکھیں کھولیں اور پوچھا کیا خبر ہے۔ اس کو بتایا گیا کہ اس کو قید کرنے والے، اس کے کریا کرم کا انتظام کر رہے ہیں۔

بوڑھے کی آنکھیں ہنسنے لگیں۔

موت گھبرا گئی۔

آخری چند گھنٹوں میں موت نے بے تحاشا پے در پے حملے کئے۔ دل کی حرکت تقریباً روک دی۔ بدن کی طاقت سلب کر لی۔ بیہوشی کا غلبہ کیا۔ مگر ایک لافانی روح پر، ایک نڈر دل پر موت کا کوئی ہتھیار کارگر نہ ہو سکا۔

اکیس دن پورے ہو گئے۔ بوڑھے نے آنکھیں کھولیں۔ اس کی آنکھیں مسکرا رہی تھیں۔

بوڑھے نے اپنی بیوی کے ہاتھ سے سنترے کے عرق کا ایک گلاس پیا۔

بوڑھے کے قید کرنے والوں نے کریا کرم کا سامان چپکے سے ہٹوا دیا۔

موت نے اپنا بستر بوریہ سنبھالا۔